الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

فساد کے بم پر بم نہ ماریئے بلکہ
فساد کے بم کو
حکیمانہ تدبیر سے ناکارہ بنا دیجئے

مارچ ۱۹۹۱ شمارہ ۱۷۲

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

الرسالہ

अल-रिसाला



इस्लामी और तामीरी मासिक रिसाला

उर्दू मे 15 और अंग्रेज़ी मे 7 वर्षों
से नियमित प्रकाशन के बाद

अब हिन्दी में भी!

मुख्य संपादक:
मौलाना वहीदुद्दीन ख़ान

नमूने की कापी और एजेन्सी के लिए सम्पर्क करें!

मूल्य: 5 रु. वार्षिक: 60 रु.

AL-RISALA (Hindi) Monthly
C-29 Nizamuddin West
New Delhi 110 013

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

مارچ ۱۹۹۱ — شمارہ ۱۷۲

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

روزہ کا ثواب

رمضان میں ایک مہینہ کا روزہ رکھنا اسلام کی ایک خصوصی عبادت ہے اور حدیث میں مختلف طریقوں سے اس کے خصوصی ثواب کو بتایا گیا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هریرة، قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کل عمل بن آدم یُضاعفُ الحسنةُ بعشر امثالها الیٰ سبعماۃ ضعف، قال الله تعالیٰ الا الصوم فانه لی وانا اُجزی به۔ یدعُ شهوته وطعامه من اجلی۔ للصائم فرحتان۔ فرحة عند فطره وفرحة عند لقائه (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کے ہر عمل کی نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مگر روزہ کا معاملہ جدا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی خواہش کو اور اپنے کھانے کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی روزہ افطار کے وقت، اور دوسری خوشی اپنے رب سے ملنے کے وقت۔

روزہ کا یہ غیر معمولی فائدہ اس لیے ہے کہ روزہ کی مشقت آدمی کی نفسیات کے اندر غیر معمولی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی زبان سے غیر معمولی انداز کی دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔

روزہ میں جب بھوک پیاس تڑپاتی ہے تو آدمی کو اپنی بے چارگی یاد آتی ہے۔ وہ مزید اضافہ کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے۔ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے ایک حکم کی تعمیل کی، مگر میں تیرے بہت سے حکموں کی تعمیل نہ کرسکا۔ میں نے ایک دن کا روزہ رکھا مگر میں دوسرے بہت سے مواقع پر "روزہ" نہ رکھ سکا۔ تو اپنی رحمتِ خاص سے مجھے بخش دے۔

جب بندہ کی زبان سے اس قسم کی دعائیں نکلتی ہیں تو خدا کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد "دس گنا" اور "سات سو گنا" کی حد کو توڑ کر اس کے ثواب کو بے حساب گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔

عبادت کا عمل دنیا میں کیا جاتا ہے اور اس کا اجر آخرت میں ملتا ہے۔ مگر روزہ استثنائی طور پر ایک ایسی عبادت ہے جس کے اجر کا تجربہ اسی دنیا میں کرا دیا جاتا ہے۔ افطار گویا روزہ کے اجر کا ابتدائی تجربہ ہے اور آخرت کا بے اندازہ ثواب اس کا انتہائی تجربہ۔

فرسٹ سکنڈ

رابرٹ ہومز (Robert Holmes Court) آسٹریلیا کا ایک تاجر تھا۔ اس نے ۱۹۶۲ میں مغربی آسٹریلیا میں ایک ادنیٰ مل سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ وہ تیزی سے ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ایک اقتصادی سلطنت (Fanancial empire) بنا لی۔ اس کی دولت ایک بلین ڈالر سے زیادہ (\$ 1.1 billion) تک پہنچ گئی۔ ۱۹۸۷ سے اس کو زوال شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی آدھی دولت کھودی۔ ستمبر ۱۹۹۰ میں اس کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ پرتھ (Perth) کے پاس اپنے ہارس فارم میں اس کا انتقال ہوگیا۔ بوقت وفات اس کی عمر ۵۳ سال تھی۔

ٹائم (۱۷ ستمبر ۱۹۹۰) نے اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک وقت وہ ملک کا فرسٹ دولت مند شخص سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب وہ مرا تو وہ اپنے ملک کا سکنڈ دولت مند شخص تھا جس کی دولت گھٹ کر ۶۵۰ ملین ڈالر ہوگئی تھی :

> Once the country's wealthiest man, he died the second richest (after fellow enterpreneur Kerry Packer), with an estimated fortune of \$ 650 million

اس دنیا میں ہر آدمی کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ یہاں ہر آدمی موت سے پہلے "فرسٹ" بنا رہتا ہے۔ مگر موت ہر آدمی کو "سکنڈ" بنا دیتی ہے۔ موت سے پہلے آدمی سمجھتا ہے کہ یہاں صرف میں ہوں، میرے سوا یہاں کوئی دوسرا نہیں۔ مگر موت آدمی کو بتاتی ہے کہ یہاں حقیقی وجود صرف خدا کا ہے، کسی "میں" کی یہاں کوئی حقیقی حیثیت نہیں۔

موت ہر آدمی کے لیے بے رحم معلّم ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اُس حقیقت کو خود جان لے جو بے رحم معلم کے ذریعہ اسے بتائی جانے والی ہے۔ خود جاننے والا شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں بینا قرار پائے گا۔ اور جو شخص اس بات کو بے رحم معلم کے ذریعہ جانے، وہ اندھا ہے۔ اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اندھا بن کر ابد تک اندھیری وادیوں میں بھٹکتا رہے۔ اور کبھی ان سے نکلنے کا راستہ نہ پائے۔

کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب ایک مسٹر فرسٹ اپنے آپ کو مسٹر سکنڈ کے مقام پر کھڑا ہوا پائے۔

نبی متکلّم

ایک عالم کا قول ہے کہ جس آدمی کے گھر میں احادیث کا کوئی مجموعہ ہو، گویا کہ اس کے اندر خود نبی بات کرتے ہوئے موجود ہیں (مَن کَانَ فِی بَیتِہٖ مَجمُوعَۃ مِنَ الاحَادِیث فَکَاَنّمَا فِیہِ نبِیّ یتکلم)

یہ بات بظاہر سادہ سی ہے مگر وہ بے حد اہم ہے۔ آج انسان کے پاس صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کلام نہیں ہے بلکہ دوسرے انبیاء کا کلام بھی موجود ہے۔ مثلاً تورات اور انجیل میں بہت سے نبیوں کے کلام درج ہیں۔ مگر ان کتابوں کے بارہ میں نہیں کہا جا سکتا کہ جس گھر میں یہ کتابیں موجود ہوں، اس گھر میں انبیاء بات کرتے ہوئے موجود ہیں، جب کہ پیغمبر اسلام کے بارہ میں یہ بات بالکل لفظی طور پر درست ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے انبیاء کا جو کلام آج مذہبی کتابوں میں موجود ہے، وہ معتبر نہیں ہے۔ ان میں تحریف، ملاوٹ اور نقل کے نتیجہ میں کثرت سے تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اس بنا پر بظاہر اگرچہ پیغمبر کا کلام موجود ہے، مگر وہ اِس صورت میں نہیں ہے کہ ان پر اعتبار اور اعتماد کیا جا سکے۔

جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ آپ کا کلام پوری طرح پیغمبر کا کلام ہے، آپ کے کلام کی جمع و تدوین میں اتنی زیادہ محنت اور احتیاط کی گئی ہے اور اس کی صحت نقل میں اتنا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ آج جو "مجموعہ حدیث" ہمارے پاس موجود ہے، اس کی بابت پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیغمبر کا کلام ہے۔

اس طرح پیغمبر اسلام گویا ابدی طور پر ہمارے درمیان موجود ہیں۔ وہ ان احادیث کے ذریعہ مسلسل ہم سے ہم کلام ہیں۔ وہ ہم کو ہدایت دے رہے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ وہ ہر تاریکی میں ہم کو روشنی دکھا رہے ہیں۔

مگر یہ متکلم رسول صرف اس شخص کے لیے ہے جو اپنے اندر سننے والا کان رکھتا ہو۔ جس آدمی کے پاس سننے والے کان نہ ہوں، اس کے گھر میں متکلم رسول موجود ہوگا، مگر وہ اس کی آواز نہیں سنے گا۔ وہ اسی طرح اندھا بہرا بنا رہے گا جس طرح پیغمبر کے زمانہ میں بہت سے لوگ اس کی بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے اندھے اور بہرے بنے رہے۔ وہ انسان بھی کیسا محروم انسان ہے جس کے پاس نبی متکلم موجود ہو مگر وہ اپنے آپ کو نبی متکلم کا مخاطب نہ بنا سکے۔

حکیمانہ تدبیر

مسٹر یوسف خان مئی ۱۹۹۰ میں لندن میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف مسلمانوں نے جو ایجی ٹیشن چلایا اس کو عام طور پر انگریزوں نے بہت ناپسند کیا۔ انگلینڈ میں شاید کوئی ایک بھی انگریز نہیں جو مسلمانوں کے اس ایجی ٹیشن کی وجہ سے ان کا ہم خیال ہو گیا ہو۔ دوسری طرف اسی انگلینڈ (لندن) میں اس کے بالکل برعکس مثال موجود ہے۔ انھوں نے بتایا کہ لندن کے ٹی وی ادارہ نے ایک خصوصی پروگرام بنایا۔ انھوں نے شہر کے باہر پرسکون مقام پر ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے آٹھ آدمی منتخب کیے۔ ان میں چار مسلم نوجوان تھے جن کا کہنا تھا کہ سلمان رشدی کی کتاب پر بین لگنا چاہیے اور چار غیر مسلم (عیسائی) تھے جو یہ کہتے تھے کہ یہ آزادیٔ تحریر کا معاملہ ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا ایجی ٹیشن کرنا درست نہیں۔ ان چار غیر مسلموں میں ایک عیسائی کتب فروش بھی تھا جو اپنی دکان پر سلمان رشدی کی کتاب (دی سیٹینک ورسز) کا اسٹاک رکھے ہوئے تھا اور دکان کی بیرونی الماری میں اس کتاب کو ڈسپلے کیے ہوئے تھا۔ مسلمانوں کے مطالبہ کے باوجود وہ اس کتاب کو الماری سے ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ان آٹھ آدمیوں کو مذکورہ مکان میں چار دن تک رکھا گیا۔ وہ وہاں ایک ساتھ کھانا کھاتے اور سنجیدہ انداز میں سلمان رشدی اور اس کی کتاب کے مسئلہ پر گفتگو کرتے۔ ان کے ساتھ ٹی وی کا عملہ بھی موجود تھا جو ان کی تمام سرگرمیوں کو برابر ریکارڈ کرتا رہا۔

آخری دن جب ان سے انٹرویو لیا گیا تو چاروں مخالفین اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ یہ کتاب نہیں چھپنا چاہیے تھی۔ حتی کہ کتب فروش نے صاف لفظوں میں یہ بات کہی کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں مسلمانوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اپنی دکان پر سلمان رشدی کی کتاب کی نمائش نہ کروں:

I have decided not to dispaly *The Satanic Verses* in my shop in deference to the sentiment of the Muslims.

اس دنیا میں ناکامی اور کامیابی دونوں زیادہ تر طریق کار کا معاملہ ہے۔ یہاں غلط طریق کار اختیار کرنے والا آدمی ناکام ہوتا ہے اور صحیح طریق کار اختیار کرنے والا آدمی کامیاب۔

خاموش تدبیر

الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ - ۱۹۱۴) اصلاحی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اس اعتبار سے انھوں نے قدیم اُردو شاعری کا جائزہ لیا تو وہ انھیں نہایت بے معنی نظر آئی۔ انھوں نے پایا کہ قدیم اُردو شاعری میں مبالغہ ہے۔ حسن و عاشقی کی داستان ہے۔ فرضی خیال آرائی ہے۔ حالی نے اس شاعری پر سخت تنقید کی اور اس کے بجائے بامقصد شاعری کی وکالت کی۔

یہ تنقید ان لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی جو قدیم اردو شاعری کو اپنے لیے فخر کا سرمایہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کو برداشت نہیں ہوا کہ ایک شخص ان کے پرفخر اثاثہ کو بے قیمت بتائے۔ چنانچہ وہ حالی کے دشمن ہو گئے۔ ان لوگوں نے حالی کے خلاف نہایت غیر سنجیدہ قسم کے مخالفانہ مضامین چھاپنے شروع کیے۔ حالی نے اس لغو طوفان کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔ اس پر اودھ پنچ (لکھنؤ) نے ایک فاتحانہ نظم شائع کی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے　　　میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مخالفت برائے مخالفت کا یہ طوفان مکمل طور پر یک طرفہ تھا۔ اس لیے وہ بہت زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد مخالفین خاموش ہو گئے۔ حالی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے مخالفین کیسے چپ ہو گئے۔ وہ تو بظاہر چپ ہونے والے نظر نہیں آتے تھے۔ حالی نے اس کے جواب میں ایک نظم لکھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ　　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کوئی شخص سنجیدہ اختلاف اور علمی تنقید کرے تو وہ بلاشبہ قابل غور ہوتی ہے۔ اگر وہ درست ہے تو اس کو مان لینا چاہیے اور اگر اس کے اندر استدلالی نقص ہے تو دلائل کے ساتھ اس کی غلطی کا تجزیہ کرنا چاہیے۔

مگر جو مخالفت برائے مخالفت ہو، جو علمیت اور سنجیدگی سے خالی ہو، جس کی بنیاد حقائق کے بجائے الزام تراشی اور عیب جوئی پر ہو، ایسی مخالفت کا بہترین جواب خاموشی ہے۔ ایسے لوگوں کا جواب دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص چیختے ہوئے گدھے کے سامنے اغضض من صوتك (لقمان ۱۹) کا وعظ کہنے لگے۔

قول بلا فعل

ایک مسلمان بزرگ ہیں۔ وہ الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ تاہم انھیں اس سے اختلاف تھا کہ الرسالہ میں ہمیشہ صبر کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: اب آپ کی کیا رائے ہے۔ اب تو حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اب جہاد ناگزیر (inevitable) ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا عمل قرآن و حدیث کے تحت ہوگا یا اس سے آزاد۔ انھوں نے کہا کہ قرآن و حدیث کے تحت ہوگا، مگر کیا قرآن و حدیث میں جہاد اور جنگ کی باتیں نہیں۔ میں نے کہا کہ یقیناً ہیں۔ مگر قرآن کے مطابق یا صبر ہے یا جنگ۔ ان کے سوا کوئی تیسری صورت نہیں۔ اور آپ اسی تیسری صورت کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ "تیسری صورت" کیا ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کے مطابق آپ کے لیے یا تو صبر کرنا ہے یا لڑنا ہے، یہی دو صورتیں اسلام کے مطابق اختیار کی جاسکتی ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی لڑائی نہ کرے، وہ صرف لڑائی کی بات کرے۔ یہ تیسری صورت قرآن کے نزدیک کوئی اسلامی عمل نہیں، بلکہ وہ ایک جرم ہے جو اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بات قرآن و حدیث کی مختلف تصریحات سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو، تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت ناراضی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں مل کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں (الصف ۲-۴) قرآن کی یہ آیتیں مدینہ کے ان مسلمانوں کی بابت اتریں جو لڑائی کی بات کرتے تھے مگر وہ عملاً لڑائی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں خدا کی ناراضی کا اعلان کیا گیا۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے صبر کا حکم ہے۔ یہی میرا قول ہے اور میں اس قول پر عمل کر رہا ہوں۔ آپ حضرات کا قول اس کے برعکس یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے لڑائی کا حکم ہے۔ پھر آپ لوگ اپنے قول پر عمل کیجئے۔ ایسے لوگ اگر لڑائی نہ کریں، بلکہ صرف لڑائی کی بات کریں تو وہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک گناہ کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناراض کر دینے والا ہے۔ لڑائی نہ کرنا مگر لڑائی کی بات کرنا ایک نہایت سنگین روش ہے لیکن آج مسلمانوں کے عوام و خواص کی بیشتر تعداد اسی سنگین روش میں مبتلا ہے۔

انعام کی خوشی

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۰ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ ۱۹۹۰ کے نوبیل امن انعام (Nobel peace prize) کے لیے ناروے کی کمیٹی نے سوویت یونین کے صدر میخائیل گورباچیف کا نام چنا ہے۔ یہ انعام ان کو دینا اس لیے طے کیا گیا ہے کہ انھوں نے بین اقوامی امن کے عمل میں رہنمایانہ کردار ادا کیا:

for his leading role in the international peace process.

یہ باعزت انعام ان کو اوسلو میں ۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کی ایک خصوصی تقریب میں دیا جائے گا۔ اس انعام میں تمغہ اور سرٹیفکٹ کے علاوہ سات لاکھ ڈالر ($ 710,000) کی رقم شامل ہوگی۔

۶۰ سالہ روسی لیڈر کو یہ خبر ناروے کے روسی سفیر (Dagfinn Stenseth) نے کرملین میں ان سے ملاقات کر کے انھیں پہنچائی۔ اس کے جلد ہی بعد ملکی اور غیر ملکی اخبار نویس کرملین پہنچے اور گورباچیف سے ان کے تاثرات پوچھے۔ انگریزی رپورٹ کے مطابق، وہ زیادہ نہ بول سکے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے لمحات میں آدمی کے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔ اس کو سن کر میں بے حد متاثر ہوا ہوں:

Words fail one at such moments. I am moved.

اسی دوران دوسرا واقعہ ڈاکٹر منڈیلا (Nelson Mandela) کے ساتھ ہوا جو جنوبی افریقہ کی سیاہ فام آبادی کے لیڈر ہیں۔ ان کو ہندستان بلا کر بھارت رتن کا اعلیٰ ترین انعام اور پچاس لاکھ ڈالر (۵ ملین ڈالر) کا چیک دیا گیا، حکومت کی طرف سے ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۰ کو جب وہ ہندستان سے واپس جا رہے تھے تو انھوں نے (ہندستان ٹائمس ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰) کہا کہ ہندستان آنا میری زندگی کا بہت یادگار لمحہ تھا۔ اس نے میری روح کے اندر تموج پیدا کر دیا:

It has thrilled me all the way. (p. 3)

دنیا کا انعام، آخرت کے انعامات کے مقابلہ میں، بہت کم ہے۔ پھر دنیا کا معمولی انعام جب آدمی کو اتنے سرور میں مبتلا کر دیتا ہے تو آخرت کے عظیم تر انعام کو پا کر آدمی کے اندر کتنا زیادہ سرور پیدا ہوگا۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔ وہ دنیا کے بجائے آخرت کے لیے کام کرنے لگے۔

فرض کی ادائیگی

ظل عباس عباسی صاحب (پیدائش ۱۳۴۴ھ) ایک صحافی ہیں۔ وہ مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۸۲ء سے وہ اخبار ملاپ (دہلی) سے وابستہ ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۰ کی ملاقات میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس میں بہت بڑا اسبق ہے۔

ظل عباس عباسی صاحب جب ملاپ کے دفتر میں آئے تو ان کے لیے جمعہ کی نماز کا مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ اخبار کے مینجر مسٹر پریم ناتھ چوپڑا (۵۸ سال) کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میں جمعہ کے دن نماز کے لیے مسجد جاؤں گا۔ اس میں جتنی دیر لگے گی، اتنی دیر مزید کام کر کے میں اپنا چھ گھنٹہ کارکردگی کا وقت پورا کردوں گا۔ مسٹر چوپڑا نے انھیں فوراً اجازت دے دی۔

ظل عباس عباسی صاحب نہایت پابندی کے ساتھ اپنے قول پر عمل کرتے رہے۔ وہ ہر جمعہ کو نماز کے وقت آفس سے چلے جاتے اور جتنی دیر انھیں لگتی، اتنی دیر مزید کام کر کے اپنے اوقاتِ کارکردگی کو پورا کر دیتے۔

ہفتے اور مہینے گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ رمضان کا زمانہ آگیا، ابھی رمضان کا مہینہ شروع ہونے کو چند دن باقی تھے کہ مسٹر پریم ناتھ چوپڑا جناب ظل عباس عباسی صاحب کے کمرہ میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے روزے شروع ہونے والے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ روزہ رکھتے ہیں۔ اب آپ اپنے اوقات تبدیل کر کے اس طرح کر لیں کہ آپ کو کوئی زحمت نہ ہو۔ ہماری طرف سے اجازت ہے کہ آپ جب چاہے آئیں اور جب چاہے جائیں۔ رمضان کے مہینہ بھر آپ کے اوپر دفتری اوقات کی پابندی لازم نہ ہوگی۔

جس طرح نماز کی ادائیگی ایک فریضہ ہے، اسی طرح یہ بھی ایک فریضہ ہے کہ آدمی اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح ادا کرے۔ اگر نماز پڑھنے والے اس حقیقت کو جانیں اور اپنے اندر دونوں صفات پیدا کر لیں تو نماز ان کے لیے بیک وقت دو عظیم فائدوں کا ذریعہ بن جائے گی۔ ایک طرف وہ ان کے اندر روحانی صفت پیدا کر کے انھیں خدا سے قریب کرے گی۔ دوسری طرف ان کے اندر وہ اخلاقی صفت پیدا کرے گی جس کے ذریعہ وہ بندوں کی نظر میں محبوب و مقبول بن جائیں۔

دوعملی

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو کویت میں اپنی فوجیں داخل کر دیں اور اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس پر تمام علمار نے مذمت کے بیانات دیے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سعودی حکمراں ملک فہد کے نام ٹیلی گرام بھیجا۔ اس ٹیلی گرام میں مولانا نے کویت پر عراق کے غاصبانہ قبضہ کی مذمت کی اور یہ اپیل کی کہ عراق اپنی فوجوں کو کویت سے واپس بلالے (اخبار العالم الاسلامی ۳ ستمبر ۱۹۹۰)

۱۶ ستمبر ۱۹۹۰ کو دہلی میں "کل ہند تحفظ حرمین شریفین کانفرنس" ہوئی۔ یہ کانفرنس مولانا منت اللہ رحمانی کی صدارت میں ایوان غالب میں ہوئی۔ اس کا افتتاح مسلم مجلس مشاورت کے صدر شیخ ذوالفقار اللہ نے کیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علمار نے اس میں شرکت کی۔ کانفرنس میں متفقہ طور پر پاس کی گئی قرارداد میں کویت پر عراق کے غاصبانہ قبضہ کی پرزور مذمت کی گئی۔ مطالبہ کیا گیا کہ عراق بلاشرط اپنی فوجیں کویت سے واپس بلالے۔ اور کویت کو اس کے نقصانات کا معاوضہ ادا کرے۔ کانفرنس نے عراق کے حکمراں ٹولہ کے بے بنیاد پروپگنڈا کی مذمت کی اور کہا کہ مسلمان ان جھوٹے پروپگنڈوں سے متاثر نہ ہوں۔ (قومی آواز ۱۷ ستمبر ۱۹۹۰)

اس قسم کے مذمتی بیانات سراسر بے فائدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیانات قیادت کے تقاضے کے تحت دیے جاتے ہیں نہ کہ اصول کے تقاضے کے تحت۔ اُن کی مذمت اگر اصولِ حق کی خاطر ہوتی تو وہ ہر غاصبانہ قبضہ کی مذمت کرتے۔ جب کہ وہ صرف اس غاصبانہ قبضہ کی مذمت کر رہے ہیں جس سے ان کا قیادتی مفاد وابستہ ہو۔

ہندستان میں انفرادی سطح پر عین اسی قسم کے قبضۂ غاصبانہ کے واقعات ہو رہے ہیں جیسا واقعہ کویت میں ہوا۔ مگر ہمارے علمار ان کی مذمت نہیں کرتے۔ عراق کے غاصب کے جھوٹے پروپگنڈوں کی وہ تردید کرتے ہیں، مگر اپنے ملک کے غاصب کے جھوٹے پروپگنڈوں کو مان کر وہ خود اس کے سرپرست بن جاتے ہیں۔

مسلم رہنماؤں کی یہ دوعملی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس دوعملی نے ہمارے رہنماؤں کی تمام کارروائیوں کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ اس دوعملی کے باقی رہتے ہوئے ہرگز مسلمانانِ ہند کا بھلا ہونے والا نہیں۔

موت کی خبر

روزانہ اخبارات میں جو خبریں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک مستقل خبر وہ ہے جس کو موت کا کالم (obituary) کہا جاتا ہے۔ یہ خوش حال گھرانوں کی موت کے واقعات ہیں۔ مرنے والے کی تصویر کے ساتھ اس کی موت کی خبر ہوتی ہے اور پھر بتایا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر ان کی آخری رسوم ادا ہوں گی۔ دوست اور رشتہ دار وہاں آکر متوفی کی آخری رسوم میں شرکت کریں۔

۱۵ ستمبر ۱۹۹۰ کے اخبار سے دو مثالیں لیجئے۔ آج ٹائمس آف انڈیا کے آخری صفحہ پر اسی قسم کی ایک باتصویر خبر ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ——— رامیش گوئل، ایک بہترین آدمی بالکل جوانی کی عمر میں اچانک امریکہ میں انتقال کر گئے:

Ramesh Goel, a good man has died suddenly at a very young age in U.S.A

ہندستان ٹائمس کے صفحہ ۴ پر ایک باتصویر خبر اس طرح چھپی ہے ——— گہرے رنج اور افسوس کے ساتھ ہم مطلع کرتے ہیں کہ ہمارے محبوب پی ایس پاتھیجا کا ۹ ستمبر کو ایک کار حادثہ میں اچانک اور بے وقت انتقال ہو گیا:

With profound grief and sorrow we inform the sudden and untimely demise of our beloved P.S. Patheja in a car accident on September 9, 1990.

موت ہماری دنیا کا ایک عام واقعہ ہے۔ کسی شخص کی موت کے بعد اس کے ورثار یا اس کے جاننے والے اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ قومی رواج کے مطابق اس کی آخری رسوم ادا کر دیں۔ ہندو اپنے رواج کے مطابق، اور مسلمان اور دوسری قومیں اپنے رواج کے مطابق۔

مگر صرف اتنا کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے شخص کی موت خود اپنے لیے موت کی خبر ہے۔ موت کا اصل فائدہ یہ ہے کہ مرنے والے کی موت کو دیکھ کر زندہ رہنے والے اپنے مرنے کو یاد کریں۔ وہ دوسرے کے انجام میں خود اپنے انجام کو دیکھ لیں۔ موت سے نصیحت لینا سب سے بڑا کام ہے، مگر یہی وہ کام ہے جس کو کرنے والا آج کی دنیا میں کوئی نہیں۔

صبر کا پھل

نسیم علی خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۹) گیارہ سال سے بمبئی میں رہتے ہیں۔ ۲۳ اگست ۱۹۹۰ء کی ملاقات میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا جو بہت سبق آموز ہے۔

بمبئی میں سیوری کراس روڈ کے علاقہ میں "مقدس مسجد" کے نام سے ایک مسجد ہے۔ یہاں پچھلے ۲۵ سال سے تبلیغی جماعت کا کام ہو رہا تھا۔ تین سال پہلے کی بات ہے، ایک روز سنی (بریلوی) مسلمانوں کی ایک جماعت اچانک مسجد میں آگئی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، وہ کھڑے ہو کر سلام پڑھنے لگے۔ دوسرے مسلمانوں نے انھیں روکا۔ اس پر بات بڑھی، اور پولس بلانی پڑی۔

آخر کار بریلوی حضرات کے مطالبہ پر یہ طے ہوا کہ ہم سلام نہیں پڑھیں گے مگر تبلیغی جماعت والے بھی یہاں اپنی کتاب پڑھنا بند کر دیں۔ اس پر تبلیغ والے راضی ہو گئے۔

اب مسجد میں تبلیغ والوں کی کتاب کا پڑھنا بند ہو گیا۔ تاہم تبلیغ والوں نے اپنا کام بند نہیں کیا۔ اب وہ مسجد کے دروازہ پر اپنا پروگرام کرنے لگے۔ تبلیغ والوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ البتہ اخلاقی تدبیریں کرتے رہے۔ مثلاً ایک بار انھوں نے سیوری کے سنی مسلمانوں کے سرکردہ افراد کو کھانے پر بلایا۔ ان کے لیے عمدہ طریقہ پر دعوت کا انتظام کیا، وغیرہ۔

یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ تبلیغ والے صبر کے ساتھ مسجد کے باہر اپنا پروگرام کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش تدبیری کے ذریعہ ان کے دلوں کو نرم بھی کرتے رہے۔ آخر کار تمام مخالف لوگ نرم پڑ گئے، یہاں تک کہ انھوں نے تبلیغ والوں کو اجازت دے دی کہ وہ مسجد کے اندر آکر اپنا پروگرام کر سکتے ہیں۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اسی کے ذریعہ تمام مسئلے حل ہو سکتے ہیں، خواہ وہ مسئلہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان پیدا ہوا ہو یا مسلمان اور ہندو کے درمیان۔

موجودہ دنیا آزادی کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہے۔ اس لیے یہاں ایک دوسرے کے درمیان اختلاف کا پیش آنا عین فطری ہے، اس کا حل ٹکراؤ میں نہیں۔ اس کا واحد حل وہی ہے جس کو "حکمتِ اعراض" کہا جاتا ہے۔

تبدیلیٔ مذہب

ٹائمس آف انڈیا (۱۱ اگست ۱۹۹۰) میں صفحہ ۹ پر مسٹر الوک رائے کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے ـــــــــ صرف متعصب لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ تبدیلیٔ مذہب کا سبب جبر و تشدد ہوتا ہے:

Only bigots feel that conversions follow invasions.

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ٹیپو سلطان فلم کے بارہ میں وشو ہندو پریشد نے پُرشور مانگ کی تھی کہ اس کی نمائش پر پابندی لگا دی جائے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ ٹیپو سلطان نے اٹھارویں صدی کے ملابار میں بہت سے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا تھا۔

مضمون نگار نے اس مانگ کا مذاق اڑایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر بحث کی خاطر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ ٹیپو سلطان نے ملابار کے ہندوؤں کو مسلمان بنایا تھا تو اس جبر و تشدد کے خلاف آواز سب سے پہلے ملابار سے بلند ہونی چاہیے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان یا ہندو کسی نے بھی اس قسم کی آواز نہیں اٹھائی۔

اسی طرح مضمون نگار نے میناکشی پورم کا ذکر کیا ہے۔ میناکشی پورم میں جب کچھ ہریجنوں نے اسلام قبول کیا تو کٹر ہندوؤں نے کہا کہ ان ہریجنوں کو پیسہ دے کر اسلام میں داخل کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ بالفرض اگر یہ دعویٰ صحیح ہو تو ان ہندوؤں کے لیے نہایت آسان تدبیر یہ ہے کہ وہ ان مسلمان ہونے والے ہریجنوں کو کچھ زیادہ رقم دے کر دوبارہ انھیں ہندو بنالیں:

Concerned Hindus should outbid the converters.

مضمون نگار نے اس بات کی وکالت کی ہے کہ آدمی کو مذہبی عقیدہ کی مکمل آزادی حاصل رہنا چاہیے۔ آدمی چاہے ایک مذہب پر رہے، چاہے اس کو بدل کر دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ لوگوں کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے: (And they have a right to do so.)

مضمون نگار کی یہ بات بالکل درست ہے۔ اگر ہم یہ کریڈٹ لینا چاہتے ہیں کہ انڈیا میں ہم نے ڈیموکریسی قائم کی ہے تو ہم کو تبدیلیٔ مذہب کی اجازت بھی ضرور دینی ہوگی۔ ورنہ ڈیموکریسی کا دعویٰ جھوٹا ہو کر رہ جائے گا۔

امن اور ترقی کی طرف

۱۹ نومبر سے لے کر ۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ تک میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس دوران میرا قیام امریکہ اور جاپان میں رہا۔ امریکہ میں ایسے مسلمان بڑی تعداد میں ہیں جو ہندستان، پاکستان وغیرہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور اب امریکہ کے شہری بن کر وہاں پُر عافیت زندگی گزار رہے ہیں۔

سفر کے آخری دنوں میں امریکی مسلمانوں کی ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ اس میٹنگ میں ہندستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اس کا انداز تقریباً وہی تھا جو عام طور پر ہند و پاک کے مسلم لیڈروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ہر ایک نے اس معاملہ میں مسلمانوں کی مظلومیت پر غم کا اظہار کیا، اور ہندوؤں کو ظالم بتا کر ان کے خلاف پرجوش احتجاجی تقریر کی۔ حتی کہ کچھ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستانی مسلمانوں کو جہاد کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ یہ طریقہ بظاہر درست نظر آسکتا ہے، مگر وہ مسئلہ کا حل نہیں۔ اس طریقہ کا مطلب مسئلہ کو خالص اصولی اور قانونی اعتبار سے دیکھنا ہے۔ عام طور پر لوگ اظہار خیال کے وقت اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا انداز بھی اسی قسم کا ہے۔ مگر مسئلہ کے حل کے اعتبار سے یہ طریقہ بالکل کارآمد نہیں۔ اپنی ذات پر آپ اصولی معیار کا استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جب معاملہ دوسروں کا ہو تو عملی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ اصولی جائزہ میں زیادہ سے زیادہ جو چیز آپ کے حصہ میں آتی ہے، وہ فریق ثانی کے خلاف لفظی مذمت یا لفظی احتجاج ہے۔ جہاں تک اصل صورت حال کا تعلق ہے، وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔ اس طریقہ کا اول و آخر حاصل صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا ہے نہ کہ فی الواقع اختلافی مسئلہ کو ختم کرنا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو عملی نقطۂ نظر کہا جا سکتا ہے۔ یعنی نظری انصاف کے پہلو کو زیر بحث لائے بغیر یہ دیکھنا کہ مسئلہ کا واقعی حل کیا ہے۔ جو ناپسندیدہ صورت حال موجود ہے، اس کا عملی خاتمہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی دوسرا طریقہ یا تدبیر ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ معاہدہ (۶۲۸ء) کے ضمن میں اختیار فرمایا۔ اس کو ہم ایک لفظ میں، حدیبیہ پرنسپل (Hudaibiya principle)

کہہ سکتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اب تک اس عملی حل کو اختیار نہیں کیا۔

قدیم مثل ہے کہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو ہٹا لیا جائے تو تالی کا بجنا اپنے آپ بند ہو جائے گا۔ اسی عملی اصول کا تاریخی نام حدیبیہ پرنسپل ہے۔ اس پرنسپل میں معاملہ کا ایک فریق اپنے آپ کو اس پر راضی کرتا ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر فریق ثانی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرے گا، وہ یک طرفہ طور پر اپنا "ہاتھ" ٹکراؤ کے مقام سے ہٹا کر تالی بجنے کے عمل کو موقوف کر دے گا، تاکہ وہ معتدل فضا قائم ہو جس میں تعمیر و ترقی کا کام پرامن طور پر انجام دیا جاسکے۔

میں نے امریکی مسلمانوں سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس معاملہ میں ڈبل اسٹینڈرڈ نظر آتے ہیں۔ آپ لوگوں کا اپنا حال تو یہ ہے کہ آپ آخری حد تک امریکہ کے نظام سے ایڈجسٹ کر کے یہاں اپنے مستقبل کو بنانے میں مشغول ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمانوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کے نظام سے لڑ کر وہاں اپنے لئے زندگی کی تعمیر کریں۔

میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق، آپ کو ہندستانی مسلمانوں سے یہ کہنا چاہئے کہ امریکہ میں ہمارے لئے بہت سی ناموافق باتیں تھیں۔ مگر ہم نے ان سے لڑے بغیر اپنے لئے راستہ نکالا۔ اس کے نتیجہ میں یہاں ہم کو ایک کامیاب زندگی حاصل ہو گئی۔ تم لوگ بھی ہندستان میں اسی تجربہ کو دہراؤ۔ تم لوگ بھی اسی طرح وہاں کے نظام سے لڑے بغیر حکیمانہ تدبیر سے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔ مگر آپ لوگوں کا حال، اس کے برعکس یہ ہے کہ آپ اپنے لئے ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ پسند کر رہے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کے لئے ٹکراؤ کا طریقہ۔

انطباق کی دو صورتیں

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ ٹکراؤ میں۔ اختلافی معاملات، اکثر حالات میں یک طرفہ (unilateral) طریقہ پر حل ہوتے ہیں نہ کہ دو طرفہ (bilateral) طریقہ پر۔ اس یک طرفہ اصول (unilateralism) کے استعمال کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اکثریتی فریق اپنا "ہاتھ" ہٹانے پر راضی ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اقلیتی فریق اس کی ذمہ داری قبول کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ اپنے "ہاتھ" کو سامنے سے ہٹا کر معاملہ کا خاتمہ کر دے گا۔

امریکہ اور جاپان میں جو کچھ میں نے دیکھا، اور دونوں ملکوں کے بارہ میں جو کچھ پڑھا، اس کے مطابق، میری رائے ہے کہ امریکہ کی تاریخ میں اقلیتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی مثال پائی جاتی ہے۔ اور جاپان اکثریتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی ایک کامیاب مثال ہے۔

اقلیتی فریق کا ایڈجسٹمنٹ

امریکہ کے اقلیتی فریق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو عام طور پر مہاجر (immigrants) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو مختلف ملکوں سے امریکہ آئے اور پھر یہاں کے شہری بن کر یہاں رہنے لگے۔ اس سفر کے دوران اس طبقہ کے بہت سے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں مختلف ملکوں کے لوگ بھی تھے اور مختلف مذہبوں کے لوگ بھی۔

ان مہاجرین کے لئے امریکہ میں مختلف مسائل تھے۔ مگر ان مسائل میں انھوں نے یک طرفہ طور پر امریکی نظام سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر ایک ہندو جب ہندستان میں تھا تو وہ "بھارت" کو اپنا دیوتا سمجھتا تھا۔ اس کی تمام وفاداریاں بھارت کی سرزمین سے وابستہ تھیں۔ وہ فخر کے ساتھ وطنی تقدس کا وہ ترانہ گاتا تھا جس کو بندے ماترم کہا جاتا ہے۔ مگر امریکہ میں جب اس نے وہاں کی شہریت لینا چاہا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کا بھارتی عقیدہ امریکی نظریہ سے ٹکرا رہا ہے۔ اس کو امریکی شہریت صرف اس وقت مل سکتی ہے جب کہ وہ بھارت سے اپنی وفاداری کو مکمل طور پر اور مطلق طور پر ختم کر دے۔ وہ اپنی تمام وفاداریاں صرف امریکہ (U.S.A.) کے ساتھ وابستہ کرے۔ یہاں اس نے امریکی نظام سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے اصول کو بدلے۔ اس کے بجائے اس نے خود اپنے عقیدہ پر نظرثانی کی۔ امریکی دستور کے مطابق اس نے امریکہ کی غیر مشروط وفاداری کا حلف (oath of allegiance) لیا اور اس طرح وہ امریکہ کا شہری بن گیا۔

اسی طرح مسلمان کے عقیدہ کے مطابق، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جنگ کرنا حرام ہے۔ مسلمان کا یہ عقیدہ امریکہ کے قانون شہریت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ امریکہ کے دستور کے مطابق، ہر امریکی شہری پر لازم ہے کہ جب بھی کسی دوسرے ملک سے امریکہ کی جنگ پیش آئے تو کسی تحفظ یا استثناء کے بغیر وہ امریکہ کی طرف سے اس غیر ملک کے خلاف جنگ کرے۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں میری ملاقات ایک مسلمان فوجی سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ مجھے خلیج عرب

میں جانے والی امریکی فوج میں بھیجا جا رہا ہے۔ امریکہ اگر عراق کے خلاف جنگ چھیڑتا ہے تو مجھے ایک مسلم فوج کے خلاف لڑنا ہوگا جو کہ اسلام میں حرام ہے۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

امریکہ میں اس وقت تقریباً پانچ ملین مہاجر مسلمان آباد ہیں۔ ان مسلمانوں نے وفاداری کا مقررہ حلف نامہ دے کر امریکہ کی شہریت کو اختیار کیا ہے۔ انھوں نے امریکہ سے یہ مانگ نہیں کی کہ وہ اپنے قانون کو بدل کر اس میں یہ استثنائی دفعہ شامل کرے کہ مسلمان مہاجر اس وقت جنگ میں شرکت کے پابند نہ ہوں گے جب کہ امریکہ کسی مسلم ملک یا مسلم قوم سے برسرجنگ ہو جائے۔ تمام امریکی مسلمانوں نے بلابحث امریکی نظام کو قبول کرتے ہوئے اس کی وفاداری کا حلف لیا، اور خود امریکہ کی شرط پر نہ کہ اپنی شرط پر، امریکہ کے شہری بن گئے ——— امریکہ کے مہاجرین نے امریکہ میں جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کو انھوں نے ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ حاصل کیا ہے نہ کہ ٹکراؤ کے ذریعہ۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ امریکہ میں یہ قانون ہے کہ ایک شخص اگر اپنے بعد جائداد چھوڑ کر مرے تو اس کی جائداد کا ۵۰ فی صد حصہ گورنمنٹ کے خزانہ میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ ترکہ کا بیشتر حصہ متوفی کی رفیقہ حیات (spouse) کو ملے گا۔ اور نسبتاً بہت تھوڑا حصہ متوفی کی اولاد کے حصہ میں جائے گا۔

امریکہ کا یہ قانونِ وراثت واضح طور پر ہندوؤں، مسلمانوں اور اسی طرح دوسری ایشیائی قوموں کے اپنے مذہب یا کم از کم ان کی ذاتی پسند سے ٹکراتا ہے۔ مگر یہاں بھی مہاجر لوگوں نے امریکہ سے یہ مانگ نہیں کی کہ وہ اپنے قانون وراثت میں ترمیم کرے اور اس معاملہ میں اس قانونی اصول کو رائج کرے جس کو ہندستان میں "پرسنل لا" کہا جاتا ہے، تاکہ مہاجر لوگوں کو یہ قانونی حق مل جائے کہ ان کی جائداد ان کے اپنے مذہب یا اپنے خاندانی رواج کے مطابق تقسیم کی جا سکے۔

Oath of Allegiance

I hereby declare, on oath, that I absolutely and entirely renounce and abjure all allegiance and fidelity to any foreign prince, potentate, state or sovereignty, of whom or which I have heretofore been a subject or citizen; that I will support and defend the Constitution and Laws of the United States of America against all enemies, foreign and domestic; that I will bear true faith and allegiance to the same; that I will bear arms on behalf of the United States when required by the Law; that I will perform noncombatant service in the armed forces of the United States when required by the Law; that I will perform work of national importance under civilian direction when required by the Law; and that I take this obligation freely without any mental reservation or purpose of evasion: So help me God.

یہاں کے زمانۂ قیام میں میں امریکی مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ اس میٹنگ کا خاص موضوع وراثت کی تقسیم کے اسی مسئلہ پر غور کرنا تھا۔ وہاں کسی بھی شخص نے یہ تجویز پیش نہیں کی کہ امریکہ کا یہ قانون مداخلت فی الدین ہے۔ اس لئے اس پر مسلمانوں کی طرف سے سخت احتجاجی بیان شائع کیا جائے اور ملک کے تمام حصوں میں اس کے خلاف جلسے اور جلوس کے مظاہرے کئے جائیں، تاکہ حکومت پر دباؤ پڑے اور وہ موجودہ قانون وراثت میں ترمیم پر مجبور ہو جائے۔ میں نے دیکھا کہ ہر آدمی اس قسم کے بیانوں اور مظاہروں کو خارج از بحث قرار دیتے ہوئے صرف یہ بات کر رہا ہے کہ موجودہ قانون کے ہوتے ہوئے ہم اپنے مسئلہ کو کس طرح حل کر سکتے ہیں —— بیرونی ملکوں میں مقیم حضرات ہر جگہ ایڈجسٹمنٹ کی سیاست چلا رہے ہیں نہ کہ وہ سیاست جس کو ہندستان کے سطحی لیڈر دباؤ کی سیاست کا نام دئے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے امریکہ کے ماہرین قانون سے مل کر ان سے مشورہ طلب کیا کہ امریکی قانون سے ٹکرائے بغیر وہ کس طرح اس کے دائرہ میں اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

امریکی وکیلوں نے انھیں بتایا کہ امریکہ کے قانونی نظام میں وصیت نامہ (will) کی بے حد اہمیت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی موت سے پہلے اپنا باقاعدہ وصیت نامہ تحریر کر دے تو امریکہ کے موجودہ قانون کے مطابق، اس کو کسی تبدیلی کے بغیر مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس لئے آپ لوگ یہ اہتمام کریں کہ ہر آدمی اپنی موت سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھ کر اس کی رجسٹری کرا دے۔ وصیت نامہ میں وہ اپنے مذہب یا اپنے خاندانی رواج کے مطابق اپنی جائداد کے بٹوارہ کی اسکیم درج کر دے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی اسکیم کو عین اس کی وصیت کے مطابق جاری کیا جائے گا۔

تمام ہندوؤں، تمام مسلمانوں اور تمام دوسرے لوگوں نے امریکی وکیلوں کے اس مشورہ کو بلا بحث مان لیا۔ اس کے مطابق اب وہ امریکہ کے قانونی نظام سے موافقت کر کے اپنی جائداد اور اپنے ترکہ کے مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ امریکہ کے مہاجر حضرات کا جس جس معاملہ میں بھی امریکہ کے نظام یا وہاں کے قانون سے ٹکراؤ پیش آیا، اس کو انھوں نے اسی طرح ایڈجسٹمنٹ کر کے حل کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس سے پرہیز کیا کہ ایسا کوئی مسئلہ ان کے اور امریکیوں کے درمیان ٹکراؤ کا اشو بن جائے۔

بیرونی ملکوں کے جو لوگ امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں، ان میں سے کئی لوگوں سے میں نے پوچھا کہ

آپ نے اپنے ملک کو چھوڑ کر کیوں امریکہ کو اپنا وطن بنالیا۔ ان سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ یہاں ہم کو پرامن زندگی (peaceful life) حاصل ہے۔ مگر ان حضرات کا یہ بیان اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس میں یہ شامل نہ کیا جائے کہ امریکہ کی یہ پرامن زندگی انھیں وہاں کے نظام سے موافقت کرنے کی قیمت پر ملی ہے نہ کہ وہاں کے مروجہ نظام سے ٹکراؤ کرنے کی بنا پر۔

امریکہ کے مہاجر وہاں اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں امریکی نظام کی حیثیت گویا اکثریتی فریق کا ہے۔ مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ وہاں کے اقلیتی فریق نے اپنے اکثریتی مدمقابل سے کس طرح ایڈجسٹ کیا۔ انھوں نے اس معاملہ کے نظری یا اصولی پہلوؤں پر کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ بلکہ اپنے مسئلہ کے حل کے لئے وہ عملی طریقہ اختیار کر لیا جس کو ہم نے حدیبیہ پرنسپل کا نام دیا ہے۔

اکثریتی فریق کا ایڈجسٹمنٹ

اب دوسری نوعیت کی مثال لیجئے۔ یعنی وہ مثال جب کہ اکثریتی فریق نے حالات کے تقاضے کا احترام کرتے ہوئے اپنے اقلیتی فریق کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کی ایک واضح مثال جاپان کی موجودہ تاریخ میں پائی جاتی ہے۔

امریکہ سے جاپان کا سفر بحرالکاہل کے اوپر طے ہوتا ہے۔ یہ تقریباً دس گھنٹے کی طویل پرواز ہے۔ چنانچہ مسافروں کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے جہاز میں دوران سفر فلم شو دکھایا جاتا ہے۔ میں جب لاس اینجلز سے جاپان ائرلائنز کے ذریعہ ٹوکیو جارہا تھا تو راستہ میں جاپان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اسکرین پر دکھایا گیا۔ ایک منظر میں میں نے دیکھا کہ امریکہ کا قومی جھنڈا جاپان کی سرزمین پر لہرا رہا ہے۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے برٹش حکومت کا سرکاری جھنڈا ابھی تک ہندستان کے اوپر لہرا رہا ہو۔ ایسا واقعہ ہندستان میں یقینی طور پر ناقابل برداشت سمجھا جائے گا۔ مگر جاپانی قوم پچھلے ۴۵ سال سے اس کو برداشت کر رہی ہے۔ اور اس "برداشت" نے جاپان کو زبردست فائدہ پہنچایا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں امریکی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ انھوں نے سیاسی اور فوجی اعتبار سے جاپان کے اوپر اپنی بالادستی قائم کر دی۔ اس کے بعد امریکی جنرل میکارتھر نے جاپان کا نیا دستور تیار کیا، اس میں یہ لکھ دیا گیا کہ جاپان کبھی بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جاپان کے تعلیمی نظام کو مکمل طور پر امریکہ کے تعلیمی نمونہ پر ڈھال دیا گیا۔ جاپان کے

جزیرہ اوکی ناوا کو امریکہ کا فوجی اڈہ بنا کر وہاں امریکہ کا قومی جھنڈا لہرا دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ

اس معاملہ میں جاپان اکثریتی فریق کی حیثیت رکھتا تھا اور امریکہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں اقلیتی فریق کی تھی۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ جاپان اپنے اوپر امریکہ کی بالادستی کو قبول نہ کرے۔ وہ اس کے خلاف مذمت اور احتجاج کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دے، وہ امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دے۔ وغیرہ۔ مگر جاپانیوں نے اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی۔ یہ معاملہ اگرچہ ان کی قومی غیرت کے سراسر خلاف تھا۔ مگر انھوں نے نظری پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے خالص عملی نقطۂ نظر کو اپنا لیا۔ انھوں نے یہ کیا کہ یک طرفہ طور پر امریکہ کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کر کے ممکن دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی۔

۱۹۴۵ میں جب یہ قومی مصیبت پیش آئی تو جاپان کے سابق شہنشاہ ہیروہیٹو نے ریڈیو پر ایک تاریخی تقریر کی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ کی اس تقریر میں جاپان کے قومی لیڈر نے اپنی قوم کو یہ پیغام دیا کہ وہ جذباتی مظاہروں (outbursts of emotions) سے قطعی پرہیز کریں۔ وہ اپنی تمام طاقتوں کو مستقبل کی تعمیر (construction of future) کے محاذ پر لگا دیں۔ وہ اپنے آپ کو غیر ملکی نفرت (antiforeign sentiment) سے بچائیں۔ جاپان کی تعمیر نو (reconstruction) کے سوا وہ کسی اور چیز میں کوئی دلچسپی نہ لیں۔

جاپان کے لیڈر نے اپنی قوم کو اس قسم کی ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہ عزم کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کو ایک عظیم امن مہیا کرنے کے لئے ایک ایسی چیز کو برداشت کریں جو ناقابل برداشت ہے، اور اس کو سہیں جو سہی نہیں جا سکتی :

We have resolved to pave the way for a grand peace for all the generations to come by enduring the unendurable and suffering what is unsufferable.

Ian Nish, *The Story of Japan*, p. 192

اس اصول کو اختیار کرنا جاپان کے لئے اپنے آپ کو امریکہ کے ماتحت بنانے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں جاپان نے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۴۷ میں ہندستان کے پہلے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے اپنی خارجہ پالیسی میں جاپان کو کوئی مقام نہیں دیا۔

اپنے پورے دورِ حکومت میں وہ جاپان کو نظر انداز کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک، جاپان ایک وابستہ ملک (aligned nation) بنا ہوا تھا۔ اور نہرو کے اپنے ذہن کے مطابق کسی ملک کی عظمت اس میں تھی کہ وہ ناوابستہ قوم (non-aligned nation) کی حیثیت رکھتا ہو۔

مگر آج ساری دنیا جانتی ہے کہ جاپان کی اس یک طرفہ پالیسی نے جاپان کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کو وسیع پیمانے پر ایک وقفۂ تعمیر مل گیا۔ اس نے اس وقفہ کو استعمال کرکے اتنی زیادہ اقتصادی ترقی کی کہ جاپان کے اوپر امریکہ کی سیاسی اور فوجی بالادستی عملاً بے معنی ہو کر رہ گئی۔ آج جاپان خود امریکہ کی دیوپیکر کمپنیوں کو بڑی بڑی قیمت دے کر خرید رہا ہے۔ امریکہ اور جاپان کے درمیان ہر روز ایک درجن فلائٹ آتی ہے اور ہر روز ایک درجن فلائٹ جاتی ہے۔ جاپان نے ساری دنیا میں نمبر ایک اقتصادی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان پر سیاسی غلبہ حاصل کیا تھا، آج خود امریکہ زیادہ بڑے پیمانے پر جاپان کے اقتصادی غلبہ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جاپان ایک چھوٹا اور بے وسیلہ ملک ہے، اس کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا اور باوسیلہ ملک ہے۔ مگر جاپان کے مقابلہ میں آج ہندستان کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ اقلیتی فریق کے مقابلہ میں اکثریتی فریق کے اڈجسٹمنٹ کی مثال ہے۔ اس معاملہ میں امریکہ گویا اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں جاپان کی حیثیت اکثریتی فریق کی تھی۔ جاپان نے نظری پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے عملی پہلو کو اختیار کر لیا اور اپنے اقلیتی حریف سے موافقت کرتے ہوئے ممکن دائرہ میں تعمیر و استحکام کا عمل جاری کر دیا۔ یہ عملی طریقہ اتنا کارآمد تھا کہ جب اس کی تکمیل ہوئی تو جاپان نے عالمی نقشہ پر پہلے سے بھی زیادہ بڑی حیثیت حاصل کر لی۔

ہندستان کی مثال

ہندستان میں بھی ظاہری فرق کے ساتھ یہی صورت حال جاری ہے۔ یہاں کا مسئلہ بنیادی طور پر ہندو اور مسلمان کا مسئلہ ہے۔ اس معاملہ میں ہندو فریق کی حیثیت اکثریتی فریق کی ہے۔ اور مسلمان اس کے مقابلہ میں اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتا ہے۔

اکثریت اور اقلیت کا جھگڑا پچھلے ۴۵ سال سے مسلسل جاری ہے۔ عین اسی مدت میں جب کہ امریکہ کے مہاجر طبقہ نے اپنے اکثریتی فریق سے موافقت کرکے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی۔ اور اسی طرح

جاپان نے اپنے اقلیتی فریق کے ساتھ موافقت کر کے عالمی سطح پر اپنے لئے نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اسی مدت میں ہندستان کے دونوں فرقوں میں صرف دنگے اور فساد جاری رہے اور آج تک جاری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ ہندو فرقہ کوئی حقیقی ترقی کا درجہ حاصل کر سکا اور نہ مسلم فرقہ۔ دونوں کے دونوں بربادی کے گڑھے کے کنارہ کھڑے ہوئے ہیں۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں میں روزانہ وہاں کے اخبارات پڑھتا تھا۔ مگر امریکہ کے اخبارات ہندستان کی خبروں سے خالی تھے۔ اس مدت میں میں ہندستان کے حالات سے اس طرح بے خبر رہا گویا کہ ہندستان جیسے کسی ملک کا کرۂ ارض پر کوئی وجود ہی نہیں۔ ہندستان جغرافی اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کے بہترین وسائل موجود ہیں۔ اس کو آزادانہ حیثیت میں تقریباً نصف صدی تک عمل کا موقع ملا۔ مگر اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ عالمی نقشہ میں ہندستان کو کوئی بھی اہمیت حاصل نہیں۔

اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہندستان میں ان دونوں میں سے کوئی واقعہ پیش نہ آسکا، حتی کہ کسی ملکی لیڈر نے رہنمائی کے درجہ میں بھی وہ بات نہ کہی جس کی شاندار مثال امریکہ اور جاپان میں موجود تھی۔ ہندستان کو یا ہندستان کے لیڈروں کو نہ امریکہ میں کوئی نمونہ ملا اور نہ جاپان میں۔ انھیں کرنے کا کام صرف یہ نظر آیا کہ وہ بے فائدہ طور پر آپس میں لڑتے رہیں۔ یہاں تک کہ دنیا کی بین اقوامی برادری میں ایک پچھڑا ہوا گروہ بن کر رہ جائیں۔

مسئلہ کا حل

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جس کو ہم نے حدیبیہ پرنسپل کہا ہے۔ یعنی دو فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا اس پر راضی ہونا کہ وہ یک طرفہ طور پر تمام جھگڑوں کو ختم کر دے گا۔

اس معاملہ میں ہمارے لئے دو قسم کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جس کی مثال امریکہ میں ملتی ہے۔ اور دوسرا وہ جس کی مثال جاپان پیش کر رہا ہے۔ امریکہ کی مثال میں ہندستان کے اقلیتی فرقہ (مسلمان) کے لئے ایک جدید نمونہ ہے۔ اور جاپان کی مثال ہندستان کے اکثریتی فرقہ (ہندو) کے لئے جدید نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندستان کے لئے لازم ہے کہ وہ ان دو میں سے کسی ایک نمونہ کو اختیار کرے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو

اس ملک کے جھگڑے ابدی طور پر باقی رہیں گے، یہاں تک کہ ہندستان کمزور ہوتے ہوتے دنیا کے نقشہ میں ایک ناقابل لحاظ ملک بن کر رہ جائے گا۔

اکثریتی فریق (ہندو) اگر حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی تمام صحیح یا غلط شکایتوں کو یک طرفہ طور پر بھلا دے۔ وہ اینٹی مسلم طرز فکر کو چھوڑ کر حقیقی معنوں میں پرو بھارت طرز فکر اختیار کرے۔ وہ مسلمانوں کے سلسلہ میں ماضی کی تمام شکایتوں کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے اور اپنی تمام توجہ اور اپنی تمام طاقت ملک کی ترقی کی راہ پر لگا دے۔ ہندو اگر ایسا کرے تو وہ وہی کرے گا جو جاپان نے "اکثریت" کے باوجود اپنی "اقلیت" کے مقابلہ میں کیا۔ اگر ہندو ایسا کرنے پر راضی ہو جائے تو تاریخ اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کے حق میں اپنے آپ کو دہرائے گی جس کی شاندار مثال جاپان کے تجربہ میں نظر آتی ہے۔

دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ اس " حدیبیہ پرنسپل" کو یہاں کا اقلیتی فریق (مسلمان) اختیار کرے۔ مسلمانوں کو صحیح یا غلط اپنے اکثریتی فریق سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو اس تاریخی فیصلہ پر راضی کریں تو انھیں وقتی طور پر یہ کرنا ہوگا کہ وہ ہندو کے مقابلہ میں اپنی ہر شکایت کو، خواہ وہ بظاہر جائز ہو یا ناجائز، صبر اور اعراض کے خانہ میں ڈال دیں۔ ہندوؤں کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جائے تو یک طرفہ طور پر اس کو برداشت کریں۔ ہندو فساد پر آمادہ ہو جائے تب بھی وہ مقابلہ آرائی کا انداز اختیار نہ کریں۔ ہندو انھیں محرومی کا تجربہ کرائے تو اس کو بھی وہ اپنے ذہن سے نکال دیں۔ مسلمان اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھالیں، وہ مکمل طور پر اور یک طرفہ طور پر مثبت نفسیات میں جینے لگیں۔

موجودہ حالات میں صبر و اعراض کی یہ پالیسی مسلمانوں کے لئے "وقفۂ تعیر" حاصل کرنے کی تدبیر ہے۔ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اس صورت حال کو برداشت کریں۔ وہ صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کر کے صرف یہ کریں کہ ممکن دائرہ میں اپنی تعمیر و ترقی کی جدوجہد جاری کر دیں۔ تمام ناموافق باتوں کے باوجود اس ملک میں ان کے لئے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ جس چیز کو دوسرے لوگ کم محنت کر کے پا رہے ہیں، اس کو وہ زیادہ محنت کر کے اپنے لئے حاصل کر لیں۔ اور مسلمانوں کو اسی امکان کو استعمال کرنا چاہئے۔

مسلمانوں کے لئے اب بھی تعلیم، تجارت، زراعت، سماجی خدمت، وغیرہ شعبوں میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ناموافق باتوں سے اعراض کرتے ہوئے ان تعمیری میدانوں میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ یہ اگرچہ ان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو اس اعلیٰ حوصلہ مندی کا ثبوت دیں۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو یقینی طور پر یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ ۲۵ سال کے اندر اس ملک کی پوری تاریخ بدل جائے گی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کو میں جاپان ایر لائنز کے جس جہاز کے ذریعہ سفر کرکے دہلی پہنچا، اس میں تقریباً تین سو مسافر تھے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جن کو مہاجر (immigrants) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک خوشی اور خوشحالی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ایک شخص نے کہا: اگر ہم انڈیا میں ہوتے تو یہاں لڑائی جھگڑوں سے فرصت نہ ملتی۔ یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ حالات نے ہم کو امریکہ پہنچا دیا۔ وہاں ہم نے اتنی ترقی حاصل کرلی۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ امریکہ کی بات نہیں بلکہ طریق کار کی بات ہے۔ لوگ امریکہ میں جو طریق کار اختیار کئے ہوئے ہیں، مسلمان اگر اس طریق کار کو اپنا لیں تو خود اسی ملک میں وہ ساری ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اس ملک میں بھی عزت اور کامیابی کے وہ تمام مواقع پالیں گے جو اسی طریق کار کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں امریکہ کے مہاجر لوگوں نے وہاں اپنے لئے حاصل کیا ہے۔

مزید یہ کہ یہ مسلمانوں کے لئے ملک کی ایک اعلیٰ خدمت کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر اس طرز عمل کو اختیار کریں تو بالواسطہ طور پر وہ اس ملک کی عمومی ترقی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ وہ ملکی ترقی کے اس دروازے کو کھول دیں گے جو باہمی جھگڑوں کے نتیجہ میں پچھلی نصف صدی سے عملاً بند پڑا ہوا ہے۔

قرآن میں زندگی کا ایک اہم اصول ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہ زمین میں قیام حاصل کرتی ہے (الرعد ۱۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع بخشی کی صفت ایسی تسخیری صفت ہے کہ جو لوگ اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں وہ لازماً مضبوط اور مستحکم زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب اگر مسلمان مذکورہ اصول پر عمل کریں تو اس کے بعد بہت جلد ایسا ہوگا کہ وہ اس ملک میں ایک نفع بخش گروہ کی حیثیت حاصل کرلیں گے۔ اور یہ قرآن کی گواہی ہے کہ جو لوگ کسی ملک میں نفع بخش

گروہ بن جائیں وہ اس ملک میں مستحکم مقام کا درجہ بھی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔

دعوتی فائدہ

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ مسلمانوں کا اس ملک میں "حدیبیہ پرنسپل" کو اختیار کرنا ان کے لئے امریکی مہاجرین کی طرح صرف مادی فائدہ کا سبب نہیں بنے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہوگی کہ یہاں مسلمانوں کے دین کے لئے فتوحات کا وہ دروازہ کھل جائے گا جو دور اول میں حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ان کے اسلاف کے لئے کھلا تھا۔

مسلمان کی تمام حیثیتوں میں سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ نظریہ قوم ہیں۔ وہ واحد ملت ہیں جن کے پاس محفوظ دین ہے۔ انھیں اجارہ داری کے درجہ میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دنیا کو خدا کا صحیح تصور دے سکتے ہیں۔ مسلم ملت کی یہ حیثیت امکانی طور پر، اس کو ساری دنیا کے اوپر نظری امام بنا رہی ہے۔ ان کے دین کی یہ امکانی خصوصیت اگر واقعہ بن جائے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری دنیا کے اوپر فکری قیادت کا درجہ حاصل کر لیں گے۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ وہ ایک قائم شدہ دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ اور علوم انسانی کی تمام گواہیاں اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اسلام کے اندر تسخیری صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ آج وہ اس طاقت کا حامل ہے کہ اپنے آپ لوگوں کے درمیان پھیلے، اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جائے۔

آج صرف ایک چیز ہے جو اسلام کے تسخیری سیلاب کو پھیلنے سے روکے ہوئے ہے، یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نزاع اور ٹکراؤ کی موجودہ فضا ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اشتعال کی فضا نے اس معتدل ماحول کو ختم کر رکھا ہے جس میں غیر مسلم حضرات مسلمانوں کے مذہب (اسلام) کو کھلے دل کے ساتھ دیکھیں اور اس کو خود اپنی فطرت کی آواز پا کر اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

اب اشاعت اسلام کا دروازہ کھولنے کی ذمہ داری تمام تر مسلمانوں پر آگئی ہے۔ یہ خود مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ داعی اور مدعو کے درمیان کش مکش کا خاتمہ کر کے اسلام کے لئے نئی تاریخ کا آغاز کریں۔

مسلمان اگر صبر و اعراض کا یک طرفہ طریقہ اختیار کر کے باہمی نفرت کی فضا کو ختم کر دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام اپنے آپ پھیلنے لگے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ دنیا یہ منظر دیکھے گی کہ حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں وہی واقعہ دوبارہ تاریخ میں پیش آگیا ہے جو دور اول میں اس اصول کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ مسلمان اس حوصلہ مندی کا ثبوت دے سکیں کہ وہ دوبارہ اس فاتحانہ تدبیر کو دہرانے کے لئے تیار ہیں جو ان کے پیش روؤں نے چودہ سو سال پہلے دہرایا اور بظاہر شکست کے بعد وہ چیز حاصل کرلی جس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں، موجودہ حالات میں یہ مسلمانوں کے لئے ہم خرما وہم ثواب کے ہم معنی ہے ——— اس کے ذریعہ ایک طرف وہ اپنی دنیاوی زندگی کی تعمیر کے مواقع پالیں گے۔ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ ملک کے وسائل کو بھرپور طور پر اپنے حق میں استعمال کر کے اپنے آپ کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنا سکیں۔

دوسری طرف یہ تدبیر ملک میں اشاعت اسلام کے بند دروازے کو کھول دے گی۔ اس کے بعد اسلام اپنے آپ اس ملک میں پھیلنے لگے گا جس طرح موجودہ قومی جھگڑوں سے پہلے وہ مسلسل یہاں پھیل رہا تھا۔

قرآن میں "حدیبیہ پرنسپل" کا یہ فائدہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے فتح مبین بھی ملتی ہے اور اللہ کی مغفرت بھی حاصل ہوتی ہے (الفتح ۱-۲) یہ اسلامی اصول آج دوبارہ مسلمانوں کو پکار رہا ہے اور انھیں بشارت دے رہا ہے کہ اگر تم نے اس کو صحیح طور پر اختیار کر لیا تو وہ تمہاری دنیا کی کامیابی کا بھی ضامن ہے اور اسی کے ساتھ آخرت کی کامیابی کا ضامن بھی۔

روشن مستقبل

الرسالہ جنوری ۹۱ خصوصی نمبر کے طور پر بعنوان "روشن مستقبل" شائع کیا گیا تھا۔ جس میں ملک کے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا۔ اب اس شمارہ کو علیحدہ سے ایک مستقل کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ جو حضرات اس کو زیادہ تعداد میں منگوا کر تقسیم کرنا چاہیں ان کو خصوصی رعایت کے ساتھ یہ کتابچہ فراہم کیا جائے گا۔

سبب کیا ہے

قرآن میں بار بار مختلف انداز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بہت سے انسان ایسے ہیں جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے سچائی کو ہر قسم کے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے ، تب بھی وہ اس کو قبول نہیں کریں گے ۔ مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کے تذکرہ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے سامنے حق کو پوری طرح واضح کر دیا ، اس کے باوجود وہ لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے ۔ آخر میں وہ اپنی قوم سے نکل گئے اور کہا کہ اے میری قوم ، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی ۔ مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے (الاعراف ۷۹)

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں ۔ اور وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں (ان کا حال یہ ہے کہ) اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو وہ نہیں اپنائیں گے ۔ اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو وہ اپنا لیں گے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے وہ غافل رہے (الاعراف ۱۴۶)

ان دونوں آیتوں میں ایسے گروہوں کا ذکر ہے جن کو خدا کے پیغمبر کے ذریعہ اعلیٰ ترین شکل میں دعوت پہنچی ۔ اس کے باوجود انھوں نے دعوت حق کو قبول نہیں کیا ۔ اس کا سبب کیا تھا ۔ اس کا سبب ان کی بگڑی ہوئی نفسیات تھی ، نفسیات کا یہ بگاڑ اکثر حالات میں تکبر کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ مذکورہ دونوں آیتوں میں تکبر ہی کو اس کا سبب بتایا گیا ہے (الاعراف ۷۵ ، ۱۴۶)

نصیحت ہر انسان کے لئے ناپسندیدہ چیز ہے ۔ اور خاص طور پر متکبر انسان تو نصیحت کو بالکل ہی ناپسند کرتا ہے ۔ جو لوگ تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں وہ کبھی اپنے خلاف کسی نصیحت کو سننے پر راضی نہیں ہوتے ۔ ایسا کوئی حق ان کے لئے آخری حد تک ناقابل قبول ہوتا ہے جس میں انھیں اپنی شخصیت کی نفی دکھائی دے رہی ہو ۔

جو لوگ اپنے آپ کو اونچے مقام پر بیٹھا ہوا فرض کر لیں وہ کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جس میں انھیں محسوس ہو کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں انھیں اپنے اونچے مقام سے نیچے

اترنا پڑے گا۔ جو لوگ فخر اور ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوں، ان کی یہ نفسیات ان کے لئے کسی ایسی بات کو ماننے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے جس میں ان کا فخر و ناز انھیں ٹوٹتا ہوا نظر آئے۔

جو لوگ اپنا منصب احتسابِ قوم سمجھ بیٹھیں وہ اپنے مزاج کی بنا پر ایسی کسی پکار کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس میں احتسابِ خویش پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہو۔ جو لوگ آرزوؤں اور خوش خیالیوں کی دنیا میں جی رہے ہوں وہ کسی ایسے پیغام کو اپنے لئے اجنبی محسوس کرتے ہیں جس میں حقائق و واقعات کی رعایت کرکے زندگی کی تعمیر کا سبق دیا گیا ہو۔ جن لوگوں کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں کے بجائے اپنے حقوق پر ہو، جن کے اندر خارجی طرزِ فکر پیدا ہو جائے وہ ایسی کسی دعوت کو غیر ضروری سمجھ کر رد کر دیتے ہیں جس میں انھیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں اور ان کے اندر داخلی طرزِ فکر ابھارنے کی کوشش کی جائے۔

جو لوگ اپنے متعلق یہ سمجھ لیں کہ وہ بخشے ہوئے لوگ ہیں وہ ایسے پیغام کی معنویت کو سمجھ نہیں پاتے جس میں اپنی موجودہ حالت کے تحت انھیں اپنی بخشش مشتبہ نظر آتی ہو۔ جن لوگوں نے تخیلات کی رومانی دنیا میں اپنے قلعے بنا رکھے ہوں وہ کسی ایسے پیغام کو اہمیت دینے میں ناکام رہتے ہیں جس کو ماننے کی صورت میں انھیں دکھائی دے کہ وہ کسی محفوظ قلعہ میں نہیں ہیں بلکہ صحرا میں کھڑے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا ہو کہ کسی عمل کے بغیر پیشگی طور پر ان کے لئے جنت کے محلات رزرو ہو چکے ہیں وہ کسی ایسی تحریک میں حصہ لینا غیر ضروری سمجھتے ہیں جس میں عمل کی بنیاد پر جنت میں داخلہ کا راز بتایا گیا ہو۔

حق کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بگڑا ہوا مزاج ہے۔ جو لوگ بگڑے ہوئے مزاج میں مبتلا ہوں، ان کو صرف اپنے مزاج کے مطابق بات ہی اپیل کرتی ہے۔ دوسری کوئی بات، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دی جائے، وہ کسی طرح انھیں اپیل نہیں کرتی۔ اپنے مخصوص مزاج کے خلاف کسی بات کو ماننا ان کے لئے اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ بکری کے لئے گوشت کھانا اور شیر کے لئے گھاس چرنا۔



۲۹ جولائی کو ابھی ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ کمرہ کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ سوٹ میں ملبوس ایک روسی اندر داخل ہوئے۔ آتے ہی انھوں نے اردو میں بولنا شروع کیا۔ ماسکو میں ایک اردو داں کو دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر گولب یف (Isaac Gólobyev) ہیں۔ انھوں نے ماسکو یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور پھر اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ وہ سوویت وومن کے ہندی اڈیشن کے اڈیٹر ہیں، جو سوویت ناری کے نام سے نکلتا ہے۔ وہ ایک سے زیادہ بار انڈیا کا سفر کر چکے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ماسکو یونیورسٹی کے علاوہ روس کے اور بہت سے تعلیمی اداروں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ اردو پڑھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میں تو اردو کا دل دادہ ہوں"۔ ہوٹل کے کمرہ سے ہم لوگ باہر نکلے تو دو روسی عورتیں گزر رہی تھیں۔ وہ ڈاکٹر گولب یف کو جانتی تھیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے اپنی زبان میں کوئی بات کہی۔ ڈاکٹر گولب یف نے بتایا کہ وہ کہہ رہی ہیں: "اس غیر ملکی کو روسی زبان بہت اچھی آتی ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ سوویت یونین میں ہر آدمی پڑھا لکھا ہے۔ سات سال کی عمر میں اسکول جانا لازم ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ آپ مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتا ہوں، مگر جو عقیدہ رکھتے ہیں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ تین سال تک میں پاکستان میں تھا۔ میرے دفتر میں ایک مسلمان میرے ساتھ کام کرتا تھا" میں نے پاکستان میں مجبوراً روزہ رکھا۔ جب میرا ساتھی نہیں کھاتا تو میں کیسے کھا سکتا تھا" انھوں نے کہا۔

۲۹ جولائی کو دوپہر بعد ڈاکٹر گولب یف کے ساتھ ہوٹل سے نکلا۔ انھوں نے ماسکو شہر کا مختلف حصہ دکھایا۔ اس مشاہدہ میں ماسکو ایک باعظمت شہر نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ واقعۃً میں ایک سپر پاور کی راجدھانی دیکھ رہا ہوں۔ ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے نکلے تو دھوپ ہو گئی۔ اس کی وجہ سے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ دھوپ کو روسی زبان میں کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے ایک کاغذ پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے: سون تسے۔ اسی طرح میں نے ان سے پوچھا کہ ماسکو بڑا ہے (Moscow is great) کو روسی میں کس طرح کہیں گے۔ انھوں نے کہا: مَسکَوا وِلی کیا۔

کریملن کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ یہ دہلی کے لال قلعہ کی مانند اس سے زیادہ بڑا ایک علاقہ

ہے۔ وہ زار کے زمانہ سے لے کر اب تک روسی سلطنت کا عظیم مرکز رہا ہے۔ ۱۹۵۶ تک اس کے اندر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے بعد خروشچوف نے اس کے دروازے عام لوگوں کے لئے کھول دئے۔ چنانچہ آج بھی ہزاروں آدمی اس کے اندر گھومتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں ملکی اور غیر ملکی دونوں تھے۔ تاہم اس پُر ہیبت دنیا کی خصوصیات کو لفظوں میں بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔

کریملن کے اندر کئی قدیم چرچ بھی ہیں۔ زار بادشاہوں کا مذہب عیسائیت تھا۔ اس لئے انھوں نے کریملن میں، جو گویا ان کا قلعہ اور محل تھا، چرچ بھی بنوائے۔ ایک تاریخی چرچ کو اندر سے دیکھا اس میں پیتل کے بڑے بڑے تابوتوں میں قدیم روسی بادشاہوں کی لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔ کریملن کے پورے علاقے میں حیرت انگیز حد تک صفائی موجود تھی۔ جب کہ وہاں ہم کو صفائی کرنے والے دکھائی نہیں دئے۔ صفائی کا محکمہ صبح کو صفائی کرتا ہوگا۔ مگر اس کے بعد سارے دن اس کا صاف رہنا اس کے زائرین اور اس کے باشندوں کے نظم اور صفائی پسندی کا ثبوت ہے۔

کریملن کی تاریخی چیزوں میں ایک عظیم توپ ہے جو زار کے زمانہ میں بنائی گئی۔ اس کے بڑے بڑے گولے بھی اس کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ توپ کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک بہت بڑا لوہے کا گھنٹہ ہے جو چرچ کے لئے منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ وہ بھی عمارت کے اوپر لگایا نہ جا سکا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح کتنے انسان ہیں جو دنیا میں آتے ہیں۔ مگر وہ یہاں اپنی حقیقی جگہ نہیں پاتے۔ وہ استعمال ہوئے بغیر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

کریملن کے ایک حصہ میں لینن کا مقبرہ ہے۔ تاج محل میں حسن کا پہلو نمایاں ہے مگر لینن کا مقبرہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس میں عظمت کا پہلو ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم مقبرہ کے سامنے پہنچے تو اس کے دروازہ کے باہر دو انسانی صورتیں اسٹیچو کی طرح کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ دو فوجی جوان مکمل وردی کے ساتھ رائفل لئے ہوئے آمنے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں اس قدر ساکن اور صامت تھے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان کی مورتیں ہیں۔

بتایا گیا کہ یہ مورتیں یا اسٹیچو نہیں ہیں بلکہ زندہ فوجی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ لینن کے مقبرہ کے دروازہ پر ۲۴ گھنٹہ دو مسلح فوجی جوان رہتے ہیں۔ وہ ذرا بھی ہلے بغیر کھڑے رہتے ہیں۔ چوں کہ آدمی اس طرح زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، اس لئے ہر ایک گھنٹہ پر ان کی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ جیسے ہی ایک

گھنٹہ پورا ہوتا ہے، دوسرے دو فوجی جوان خاص انداز میں چلتے ہوئے آتے ہیں اور ان کی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ روس میں لینن کو جو غیر معمولی عظمت حاصل ہے، یہ اس کا ایک مظاہرہ ہے۔

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مردہ انسان کے علامتی ڈھانچہ کی حفاظت پر اتنے زبردست پہرے لگے ہوئے ہیں، مگر دنیا میں وہ انسان کہیں نظر نہیں آتا جس نے اپنے زندہ وجود کو نفس اور شیطان سے بچانے کے لئے اپنے اوپر پہرہ بٹھا رکھا ہو۔ حالاں کہ یہ دوسرا پہرہ "مفت" میں حاصل ہوتا ہے۔ آپ اللہ سے دعا کیجئے اور اللہ کے فرشتے آپ کی پہریداری کے لئے فوراً آپ کے پاس آجائیں گے۔

ماسکو میں دنیا کا سب سے بڑا سرکس ہے۔ آج اس کا مخصوص شو تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی میرے میزبان نے مجھ کو لے جاکر وہاں بٹھا دیا۔ بادل ناخواستہ وہاں جاکر بیٹھ گیا۔ اس کی عمارت سے لے کر ہر چیز تک غیر معمولی تھی۔ حد درجہ تربیت یافتہ قسم کے آدمی، گھوڑے، اونٹ، بندر، کتے بار بار آکر طرح طرح کے تماشے دکھاتے رہے۔ ہزاروں تماشائی محظوظ ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔

مگر مجھے ان چیزوں کا کوئی ذوق نہیں۔ میں بے رغبت بیٹھا ہوا کبھی آنکھ کھولتا اور کبھی آنکھ بند کرتا۔ تاہم اس کا ایک "آئٹم" بڑا عجیب تھا۔ درمیان میں کھلے ہوئے اسٹیج پر ایک بہت بڑا جالی دار پنجرہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد پندرہ بڑے بڑے شیر اس کے اندر داخل کئے گئے۔ ایک تنہا آدمی کالا سوٹ پہنے ہوئے اس کے اندر موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً ۴ فٹ لمبی چھڑی تھی جس کی سفیدی بتا رہی تھی کہ وہ لوہے کی ہے۔ تمام شیر اس آدمی کی چھڑی کے اشاروں پر حرکت کرنے لگے۔

جس طرح ہندستان میں ایک مداری بندر کو تربیت دے کر اس سے طرح طرح کے تماشے کراتا ہے، اسی طرح یہ آدمی پندرہ شیروں کے درمیان کھڑا ہوا ان سے عمل کروا رہا تھا۔ حاضرین سانس روکے ہوئے اس حیرت ناک "شو" کو دیکھتے رہے۔ شیر کبھی کبھی آدمی کی چھڑی پر غرّاتے اور دانت اور پنجہ نکالتے، مگر اس کے باوجود وہ مجبور مخلوق کی طرح اس کے "احکام" کی پابندی کرتے رہے۔ یہ شو اتنا عجیب تھا کہ جب میں اس کو سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔

سرکس کا شو دیکھنے کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس آئے تو گھڑی میں دس بج چکے تھے۔ شام کو ۱۰ بجے ہندستان میں رات کا وقت ہوتا ہے۔ مگر یہاں ابھی فضا میں اجالا تھا اور مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔

یہ صورت حال ان ملکوں میں پیش آتی ہے جو قطبین کے قریب واقع ہوں۔ ان علاقوں میں ان دنوں رات چھوٹی ہوتی ہے اور دن بڑا۔ دوسرے موسم میں وہاں دن چھوٹا ہوتا ہے اور رات بڑی۔ جو ممالک خط استوا سے قریب ہیں وہاں یہ جغرافی مظہر دکھائی نہیں دیتا۔

۳۰ جولائی کو دوشنبہ کا دن تھا۔ میں نے ہوٹل میں ایک صاحب کو ٹیلیفون کرنا چاہا جن کا روم نمبر 1829 تھا۔ میں اپنے کمرہ کے ٹیلیفون پر یہ نمبر گھماتا رہا۔ مگر دوسرے کمرہ میں گھنٹی نہیں بجتی تھی۔ آخر ریسپشن ڈسک پر پوچھا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ کمرہ کے ٹیلیفون کا نمبر 166-42-80 ہے۔ اسی طرح میرے کمرہ کا نمبر 1029 تھا۔ مگر اس کا ٹیلی فون نمبر یہ تھا : 166-42-06 ۔ آزاد دنیا کے تمام ملکوں میں یہ قاعدہ ہے کہ کمرہ کا جو نمبر ہوتا ہے وہی اس کا فون نمبر بھی ہوتا ہے۔ مگر یہاں کے نظام میں ہر چیز پر سادگی کے بجائے پیچیدگی کا انداز چھایا ہوا ہے۔

یہاں کے پیچیدہ سسٹم کے بارہ میں اس طرح کے کئی تجربے ہوئے۔ میں نے ایک روسی تعلیم یافتہ شخص سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں بہت سے ملکوں میں گیا ہوں۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں کا نظام ہر جگہ سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ہم کو بہت سی غیر ضروری مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اور اس کی وجہ ہمارے یہاں کی حد درجہ بڑھی ہوئی بیوروکریسی ہے۔

۱۱ بجے سوویت روس کے کچھ ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ اس میں حسب ذیل افراد شریک تھے۔ مسٹر الکسی لون کوف (Alexei I. Lounko) ڈپٹی ہیڈ، ساؤتھ ایشین ڈپارٹمنٹ، اینڈری سوروکن (Andrei A. Sorokin) جنرل سکریٹری، سوویت انڈین فرینڈشپ سوسائٹی، مڈاکٹر جنادی اودیف (Gennady P. Avdeyed) سکریٹری، سوویت انڈین فرینڈشپ سوسائٹی، الکسی وی گالکن (Alexey V. Galkin) سکریٹری یو ایس ایس آر فرینڈشپ سوسائٹی۔ اس ملاقات میں زیادہ تر اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ سوویت یونین کے مسلمانوں اور انڈیا کے مسلمانوں کے درمیان تعلقات کس طرح بڑھائے جاسکتے ہیں۔

ماسکو میں قیام کے دوران بار بار شہر میں آنے جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے مختلف حصے دیکھے۔ یہاں کی ایک بات مجھے پسند آئی۔ سڑک پر اور فٹ پاتھ پر سامان بیچنے والے کہیں نظر نہیں آئے۔ جب کہ دہلی میں اور ہندستان کے دوسرے تمام چھوٹے اور بڑے شہروں میں یہ کاروباری مصیبت انتہائی عام

ہے۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے جس کی بنا پر شہر میں ہر جگہ صفائی نظر آئی۔

اسی طرح ماسکو میں کئی چیزیں میرے ذوق کے اعتبار سے بہت عمدہ تھیں، وہاں سڑکوں پر بے شمار گاڑیاں ہر وقت دوڑتی ہیں، مگر مجھے ایک بار بھی ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایک بار بھی لاؤڈ اسپیکر کا شور سننے پر مجبور ہونا نہیں پڑا۔ سائرن کی آوازیں بھی وہاں نہیں تھیں۔ پھیری کرنے والوں اور خوانچہ والوں کے شور سے پورا شہر بالکل خالی تھا۔ شہر کے کسی حصہ میں مجھے وہ منظر دکھائی نہیں دیا جس کو ہندستان کے شہروں میں جھگی جھونپڑی کہا جاتا ہے جس کو آپ دہلی اور دوسرے بڑے شہروں میں ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی جھونپڑیاں بھی کہیں پائی جاتی ہوں مگر مجھے آتے جاتے ہوئے وہ دکھائی نہیں دیں۔

مجھے خود تو یہاں ٹیکسی لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مگر ایک سیاح نے بتایا کہ ایک غیر ملکی جب یہاں ٹیکسی پر سوار ہوتا ہے تو ٹیکسی والا اس سے ڈالر کا تقاضا کرتا ہے، وہ روبل لینا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح ہر جگہ روبل کے مقابلہ میں ڈالر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے مقابلہ میں سوویت یونین کی اقتصادی حالت کیا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ روبل سے وہ صرف روسی مصنوعات خرید سکتے ہیں جو کوالیٹی میں اعلیٰ نہیں ہوتیں۔ جب کہ ڈالر کے ذریعہ ہر قسم کی اعلیٰ چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔

ہوٹل کا مغربی حصہ کھلا ہوا تھا۔ شیشوں کے اُس پار باہر کی دنیا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دیوار سے لگے ہوئے چوڑے شیشے میرے اور شہر کے درمیان مادی اعتبار سے حائل تھے لیکن نگاہ شفاف شیشوں کو پار کر کے دور تک ماسکو کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمام مادے ایسے بنائے ہوتے جن سے روشنی پار نہ کر سکے تو ایسا مشاہدہ ناممکن ہوتا۔ مگر اللہ نے کثیف مادوں کے ساتھ شیشہ جیسی چیزیں پیدا فرمائیں جن سے روشنی گزر سکتی ہے اور اس بنا پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم شیشہ کے اُس پار کے منظر کو دیکھ سکیں۔

دنیا میں اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ اس دنیا کی تخلیق منصوبہ بند انداز میں ہوئی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ دنیا کے وہ لوگ جنھوں نے کائنات کی اس منصوبہ بند نوعیت کو سب سے زیادہ کھولا، وہی یہ ثابت کرنے میں مشغول ہیں کہ دنیا کی تشکیل میں منصوبہ کا کوئی دخل

نہیں، صرف اس لئے کہ اگر وہ اس میں منصوبہ کو مان لیں تو فوراً منصوبہ ساز کو ماننا پڑے گا، اوران کا مزاج کسی منصوبہ ساز کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔

مزاجی اعتبار سے آدمی اگر کسی بات کو ماننا نہ چاہتا ہو تو دلیل اس کو منوانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، خواہ کتنے ہی زیادہ طاقت ور دلائل کے ساتھ اس کو ثابت کر دیا گیا ہو۔ خواہ کتنے ہی زیادہ حقائق اس کی تصدیق کرنے کے لئے موجود ہوں۔

حال میں سوویت روس کے اندر جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ بے حد سبق آموز ہیں۔ روس میں ۱۹۱۷ میں کمیونسٹ انقلاب آیا۔ دوسری عالمی جنگ میں کمیونسٹ روس کو یہ موقع ملا کہ وہ بہت بڑے رقبہ کو اپنے اندر شامل کر لے۔ اس موضوع پر کچھ لوگوں سے میری گفت گو ہوئی۔ میں نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سوویت روس کے لئے امریکہ سب سے بڑا نظریاتی اور فوجی دشمن تھا۔ سوویت روس کے حکمرانوں نے اپنی ساری توجہ سب سے زیادہ دو چیزوں پر لگا دی۔ ایک، تمام اشاعتی ذرائع کو استعمال کرکے یہ ثابت کرنا کہ امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام سب سے برا نظام ہے اور روس کا اشتراکی نظام سب سے بہتر نظام (9/764)

دوسری طرف روس نے اپنے بہترین سائنسی دماغوں کو جنگی اہمیت کی چیزوں کی ریسرچ پر لگا دیا۔ ۱۹۴۹ میں سوویت روس نے اپنے پہلے نیوکلیر ہتھیار کا تجربہ کیا۔ اس طرح اُس نے اِس افسانہ کا خاتمہ کر دیا کہ امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جو نیوکلیر ہتھیار رکھتا ہے (۹/۷۶۴) اس کے بعد روس نے اکتوبر ۱۹۵۷ سے اسپٹنک (مصنوعی سیارہ) کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسے مصنوعی سیارے کامیابی کے ساتھ خلا میں بھیجے جو زمین کے گرد گھومتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے بارہ میں لکھا گیا کہ سوویت روس نے تاریخ میں پہلی بار خلائی دور شروع کیا:

Soviet Union .... inaugurated the Space Age (IX/500).

سوویت روس اپنی چالیس سالہ کوششوں سے امریکہ کے بعد دوسری سب سے بڑی طاقت (سپر پاور) بن گیا۔ مگر روس کو یہ کامیابی ایک بے حد مہنگی قیمت پر ملی۔ جنگی دیو بننے کے لئے اس کو اپنے وسائل کی اتنی زیادہ مقدار صرف ایک محاذ پر لگانی پڑی کہ دوسرے اقتصادی شعبوں

کے اعتبار سے وہ ایک بونی قوم بن گیا۔ روس میں خوراک اور استعمال کی اشیاء کی فراہمی ہولناک حد تک کم ہوگئی۔ اس کے فوجی گدام خطرناک فوجی ہتھیاروں سے بھرے ہوئے تھے مگر اس کے بازار اشیاء خوراک اور عام استعمال کی چیزوں سے خالی تھے۔

اب حکمرانوں کے لئے دو صورت تھی۔ ایک یہ کہ عوام کی بربادی کے کھنڈر پر وہ بدستور اپنا سیاسی تخت بچھائے رہیں۔ کیوں کہ جو کچھ مصیبت تھی وہ عوام پر تھی، خود ان کا اپنا مسئلہ ہر اعتبار سے حل شدہ تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک انقلابی فیصلہ کریں، خواہ اس انقلابی فیصلہ کے نتیجہ میں انھیں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ سوویت روس کے موجودہ وزیر اعظم نے اسی دوسرے راستہ کو اپنے لئے اختیار کیا ہے۔

یہی وہ بات ہے جو لندن کے انگریزی اخبار سنڈے ٹائمس (۱۰ جون ۱۹۹۰) نے اپنے اداریہ میں کہی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ تاریخ کے تیز دھارے میں ایک خطرہ ہٹتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ سرد جنگ ختم ہو رہی ہے اور یہ بڑی حد تک مغرب کی فتح کے ہم معنی ہے:

In the sweep of history, as one threat recedes, another replaces it The cold war is ending, largely in victory for the west.

تاہم اس دنیا میں نہ کوئی ہار آخری ہار ہے اور نہ کوئی جیت آخری جیت۔ اگر سوویت روس نے مغرب کے مقابلہ میں اپنی عارضی "پسپائی" کو وقفۂ تعمیر کے طور پر استعمال کیا تو عین ممکن ہے کہ وہ ترقی کا نیا سفر شروع کر دے اور کسی نئی صورت میں اپنے لئے سپر پاور کا مقام دوبارہ حاصل کر لے۔

سوویت یونین ۱۵ جمہوریتوں پر مشتمل ہے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کے پاس بہترین جغرافیہ ہے۔ اس کے پاس انسانی قوت بھی موجود ہے۔ مگر ۷۰ سالہ انقلابی عمل کے باوجود وہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے ہوگیا۔ اس کا واحد سبب مارکسزم ہے۔

مارکسی نظریہ کے تحت یہاں کے تمام زرعی اور تجارتی ذرائع، بجبر افراد کے ہاتھ سے چھین کر حکومتی انتظام میں دے دئے گئے۔ اس مصنوعی انتظام نے سوویت سماج میں مقابلہ کا عمل ختم کر دیا۔ مقابلہ کی حالت کسی سماج میں ہمیشہ اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ ان کو یہ احساس ہو کہ وہ صرف اپنی

ذاتی کارکردگی سے ترقی کر سکتے ہیں۔ مگر جب تمام لوگوں کو سرکاری ملازم بنا کر انھیں مقرر تنخواہ پر ڈال دیا جائے تو لوگوں کے اندر ذاتی محرک کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب آدمی کسی چیلنج سے دوچار نہیں ہوتا جو اس کی قوت عمل کو متحرک کرے۔ ایسا سماج کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اور یہی اشتراکی روس کے ساتھ ہوا۔

اشتراکی روس کے لئے مارکسزم کا دوسرا تحفہ جنگ جوئی تھا۔ مارکس نے بتایا کہ دنیا میں بہتر نظام لانے کے لئے جنگ ضروری ہے۔ کیوں کہ استحصال کرنے والا طبقہ فہمائش کے ذریعہ اپنے مفادات سے دست بردار نہیں ہوتا۔ اس لئے مزدور طبقہ کو اس سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ برابری کا سماج قائم کرنے میں جو واحد رکاوٹ ہے اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ مارکس کا یہی نظریہ تھا جس نے سوویت یونین کو امریکہ کا دشمن بنا دیا۔ کیوں کہ "سرمایہ دارانہ نظام" کے اس سب سے بڑے ایجنٹ کو نیست و نابود کئے بغیر دنیا میں اشتراکی سماج نہیں لایا جا سکتا تھا۔ اس نظریہ نے روس کی بہترین طاقت کو جنگی کارروائیوں کی طرف موڑ دیا جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ آخرکار وہ دیوالیہ ہو کر رہ گیا۔

اب اشتراکی روس نے اس مجنونانہ قسم کے جنگی نظریہ سے توبہ کر لی ہے۔ روس کے موجودہ حکمراں میخائیل گورباچیف کو ان کی قیام امن کی خدمات پر ۱۹۹۰ کا نوبیل انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ناروے کی انعام کمیٹی کے بیان کے مطابق (ہندستان ٹائمس ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۰) گورباچیف کے پرسترائیکا (Perestroika) کے نتیجہ میں پچھلے چند سالوں میں مشرق اور مغرب کے درمیان تعلقات میں ڈرامائی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ٹکراؤ کی جگہ اب بات چیت نے لے لی ہے:

In the last few years dramatic changes have taken place in the relationship between East and West. Confrontation has been replaced by negotiation.

مگر عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے "اسلام پسند" نوجوانوں نے اس تباہ کن جنگی نظریہ کو اسلامائز کر کے اس کا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ اب ہر جگہ وہ بم اور گولی کی منطق سے اسلامی انقلاب برپا کرنے کا ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہیں۔ یہ مسلم نوجوان سید قطب، خمینی اور مودودی کے نظریات سے متاثر ہیں اور ان کو مفکرین اسلام کا خطاب دیتے ہیں۔ حالانکہ زیادہ

صحیح بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مخربین اسلام کا لقب عطا کیا جائے۔

میری لائبریری میں کمیونزم سے متعلق جو کتابیں ہیں، ان میں سے ایک ساڑھے سات سو صفحہ کی وہ کتاب ہے جو مارکس اینجلز اور لینن کی اہم ترین تحریروں (Most important writings) پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا میں ناشر کی طرف سے جو نوٹ ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ یہ تحریریں ان قوانین سے بحث کرتی ہیں جو سماج کی ترقی میں حاکمانہ اثر رکھتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ سماجی ترقی میں انقلابات کا کردار کیا ہے:

> They deal with the laws governing the development of society, tell the role of revolutions in social development.

یہ کتاب ۱۹۷۲ کی چھپی ہوئی ہے۔ اس وقت یہ حال تھا کہ ان کمیونسٹ مفکرین کی تحریروں کو آسمانی صحیفہ کی طرح اٹل اور محکم بتا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ مگر اس کی اشاعت کے ۲۰ سال بعد جب میں سوویت روس کی دنیا میں داخل ہوا تو وہاں شاید کوئی ایک شخص بھی نہ تھا جو ماضی کی ان تحریروں کو پڑھنا تو درکنار ان کا تذکرہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہو۔

اس کتاب میں لینن کا مضمون ہے۔ اس میں مذہب کو بے حقیقت بتاتے ہوئے لینن نے کہا تھا کہ مذہب عوام کے لئے افیون ہے:

Religion is opium for the people (p. 411)

آج خود اشتراکی روس کا یہ حال ہے کہ وہاں کے در و دیوار تک پکار رہے ہیں کہ مذہب ایک فطری صداقت ہے۔ اور خود مارکسزم ایک افیون ہے جس میں روسی عوام کو ۷۰ سال تک مبتلا رکھا گیا۔ "ہیرو ورشپ" کے مزاج کے تحت اگرچہ آج بھی لینن کا شخصی احترام روس میں باقی ہے، مگر اس کی تحریروں کو مقدس سمجھ کر اس کی تلاوت کرنے والا اب شاید ملک میں کوئی بھی نہیں۔

ماسکو میں میری طبیعت خراب ہو گئی۔ میں نے چاہا کہ میں مزید سفر کا سلسلہ ختم کر کے ماسکو ہی سے دہلی واپس چلا جاؤں۔ مگر معلوم ہوا کہ میں فوراً یہاں سے نہیں جا سکتا، کیوں کہ اگلی دو فلائٹ (ایر انڈیا، ایرو فلاٹ) مکمل طور پر بک ہو چکی ہیں۔ یہی حال ۲۸ جولائی کو یہاں آتے ہوئے ایرو فلاٹ کا تھا۔ بڑے جہاز کی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔

اس سے اندازہ ہوا کہ دہلی اور ماسکو کے درمیان کافی مسافر ہوتے ہیں۔ تجارت اور تعلیم اور حکومتی ضروریات کے تحت لوگ سفر کرتے ہیں۔ حالاں کہ ہفتہ میں تین فلائٹ ایئر انڈیا کی ہے۔ اور تین فلائٹ ایروفلاٹ کی۔

یہ غالباً جواہر لال نہرو کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے مخصوص مقاصد کے تحت امریکہ سے دوری اختیار کی اور روس سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ مگر نئے حالات نے ثابت کیا ہے کہ خود سوویت یونین اپنی ترقی کے لئے امریکہ کا ضرورت مند ہے۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ امریکہ ۲۰ بلین ڈالر سے اس کی مدد کرے۔ ۱۹۴۷ میں ایک طرف جاپان نے اپنی نئی زندگی شروع کی اور دوسری طرف ہندستان نے۔ جاپان امریکہ کا تعاون لے کر بڑھا۔ آج وہ تمام ملکوں سے آگے بڑھ چکا ہے۔ ہندستان نے اشتراکی روس کے تعاون سے آگے بڑھنا چاہا مگر وہ کہیں نہیں پہنچا۔

آج دنیا بھر کے لوگ جاپان کی گھڑی پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر روسی صنعت کا حال عجیب ہے۔ دہلی کے ایک انگلش جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں ان کے لئے روس کی بنی ہوئی پاکٹ واچ لے آؤں۔ کیوں کہ وہ ہاتھ کی گھڑی استعمال نہیں کرتے۔ وہ جیبی گھڑی کو پسند کرتے ہیں۔ ماسکو میں میں نے ایک واقف کار سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ روسی گھڑی اطمینان بخش نہیں ہوتی۔ اس کی پائداری کی کوئی ضمانت نہیں۔

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کے ترقی نہ کرنے کا کم از کم ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس کی قیادت نہرو کے ہاتھ میں آئی۔ نہرو پہلے سے اشتراکی ذہن کے آدمی تھے۔ بعض سیاسی اسباب کے تحت وہ روس سے قریب ہونے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے ہندستان کی ترقی کے لئے، اپنے الفاظ میں، "سوشلسٹک پیٹرن" کو اختیار کیا۔ (مثلاً پانچ سالہ منصوبے، پبلک سکٹر نیشنلائزیشن، حکومتی کنٹرول، وغیرہ) اگر انھوں نے اس کے بجائے امریکی پیٹرن کو اختیار کیا ہوتا، نیز پڑوسی ملک سے ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیتے تو مجھے یقین ہے کہ ہندستان آج ایشیا کا سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہوتا۔ سوشلزم اور جنگی بجٹ کے دو پاٹوں میں ہندستان پس کر رہ گیا، اور دونوں کی ذمہ داری جواہر لال نہرو پر آتی ہے۔

خروشچوف کے زمانہ میں ایک لطیفہ مشہور ہوا تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایک روسی کارخانہ میں

گئے۔ انھوں نے وہاں کے ایک کارکن سے کارخانہ کے حالات پوچھے۔ اشتراکی کارکن نے کارخانہ کی کارکردگی اور اس کی پیداوار کی زبردست تعریف شروع کی۔ خروشچوف کو اس کی تعریف مبالغہ آمیز معلوم ہوئی۔ اس نے کہا: تم جانتے ہو، میں کون ہوں۔ میں روس کا وزیر اعظم خروشچوف ہوں۔ کارخانہ کا کارکن معذرت کرتے ہوئے بولا۔ معاف کیجئے گا، میں سمجھا کہ آپ کوئی غیر ملکی مہمان ہیں۔

روسی صنعت کے بارہ میں یہ لطیفہ چھپا تو دنیا بھر کے کمیونسٹوں نے کہا کہ یہ سرمایہ داروں کا پروپگنڈہ ہے۔ مگر اب خود گورباچیف اور دوسرے روسی ذمہ دار کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اب سوویت روس میں ذاتی اخبار نکالنے کی اجازت ہوگئی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ ذاتی اخبارات نکال رہے ہیں۔ ان اخباروں کی قیمت سرکاری اخباروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ اخبارات سرکاری اخباروں سے زیادہ بکتے ہیں۔ اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان اخباروں میں روسی حکومت اور روسی نظام پر تنقید ہوتی ہے۔

۳۱ جولائی کی شام کو یہاں کی میٹرو (زمین دوز ٹرین) دیکھی۔ کہا جاتا ہے کہ ماسکو کی زمین دوز ٹرین دنیا کے چند بہترین نظاموں میں سے ایک ہے۔ اس کا ٹکٹ بہت سستا ہے۔ پانچ کیوپک میں کسی ایک لائن پر کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ سارا سسٹم الکٹرانک نظام پر قائم ہے۔

میرے ساتھی ڈاکٹر اودیف (Dr. Gennady P. Avdeyev) کے پاس روبل تھا۔ انھوں نے ایک خاص مشین میں اس کو ڈالا اور فوراً پانچ پانچ کیوپک کے سکے نکل آئے۔ آگے بڑھے تو اندر داخل ہونے کے لئے ایک خاص دروازہ تھا۔ یہاں ایک شخص کو پانچ کیوپک برائے ٹکٹ ڈالنا تھا۔ ہم نے پانچ کیوپک ڈالے اور دروازہ سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گئے۔ اگر کوئی شخص کیوپک نہ ڈالے تو آٹومیٹک طور پر دروازہ کے اندر سے ایک لوہا نکل کر دروازہ کو بند کر دے گا۔ ٹرین آرام دہ اور تیز رفتار تھی۔ میں ایک اسٹیشن تک جا کر واپس چلا آیا۔

ایک روبل میں ایک سو کیوپک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ عام لوگوں کے لئے بے حد سستی سواری ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا نظام تعجب خیز حد تک سادہ ہے۔ اندر کی تعمیر نہایت مضبوط اور نہایت شاندار نظر آئی۔ اگر دہلی میں اس قسم کا نظام قائم ہو جائے تو دہلی والوں کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوگا۔

ہوٹل کے ریسپشن پر ایک خاتون تھیں۔ وہ صرف روسی زبان جانتی تھیں۔ میرے گائڈ کی مدد سے انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ مسلمان ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ میں تاتاری نسل کی مسلمان ہوں۔ انھوں نے اپنا نام جمولودینوا احسانہ (جمال الدین حسنہ) بتایا۔ ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ وہ خود سے ایک روز میرے لئے چائے اور ناشتہ لے آئیں۔

میرا اندازہ ہے کہ روسی لوگ مزاجاً بہت اچھے ہیں۔ مگر یہاں قاعدے اور ضابطے اتنے زیادہ ہیں کہ چاہنے کے باوجود کوئی شخص کچھ کر نہیں سکتا۔ مثلاً ۳۱ جولائی کی شام کو دہلی کے لئے ایروفلاٹ کی پرواز تھی اور اسی دن ایر انڈیا کی پرواز تھی۔ میرے روسی میزبان نے دریافت کرکے بتایا کہ دونوں جہاز کی تمام سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔ وہ دن بھر دوڑ دھوپ کرتے رہے، مگر وہ ایروفلاٹ میں میرے لئے ایک سیٹ حاصل نہ کر سکے۔

اس کے بعد میں نے انڈین ایمبیسی کو ٹیلیفون کیا۔ سفیر صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کے سکریٹری مسٹر گووندر سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں ابھی ایر انڈیا سے معلوم کرکے بتاتا ہوں۔ صرف پانچ منٹ کے بعد دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایر انڈیا کے دفتر میں جاکر مسز سونیا سنگھ سے مل لیں۔ وہ آپ کو سیٹ دے دیں گی۔ مسٹر گووندر نے یہ سیٹ رزرو کوٹا سے دلوائی۔ اسی طرح ایروفلائٹ میں بھی رزرو کوٹا ہوتا ہے۔ مگر اس کوٹہ سے کسی غیر شخص کے لئے سیٹ حاصل کرنے کا طریقہ اتنا پیچیدہ ہے کہ وہ عملاً ناممکن ہے۔ بعض وجوہ سے میں اس فلائٹ سے سفر نہ کر سکا۔ مگر مذکورہ تقابل سے دونوں ملکوں کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسٹر گولب ییف (Isaac Golubyev) کے والدین یہودی تھے۔ مگر وہ اپنے کو لامذہب بتاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کمیونسٹ نہیں کہتے مگر خوب صورت انداز میں سوشلسٹ سماج کی تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھ کو ماسکو کے کئی علاقے دکھائے۔ دریائے ماسکو کے کنارے مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت خوش وخرم کھڑی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک عورت خاص انداز کا سفید کپڑا پہنے ہوئے تھی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ دلہن ہے۔ آج ہی ان لوگوں کی شادی ہوئی ہے۔ وہ یہاں خوشی منانے آئے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس شمپین کی بوتلیں تھیں۔ ان کو کھول کر مرد وعورت سب کھڑے ہوئے پی رہے تھے۔ (باقی)

ایک اقتباس

مختلف بابری مسجد کمیٹیوں کے لیڈر پچھلے تین برس سے مسلسل بابری مسجد کے سلسلہ میں بڑے بڑے بیان دیتے آئے ہیں۔ بلند بانگ دعوے کرتے آئے ہیں۔ اپنے جذباتی بیانات اور زوردار تقریروں سے خوب مسلمانوں کی واہ واہ لوٹ کر قوم کے لیڈر بنتے رہے ہیں۔ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں پر یہ تاثر قائم کرتے رہے ہیں کہ مسلم ووٹ ان کی مٹھی میں ہے۔ وہ جہاں کہیں گے مسلمان ووٹ ڈالے گا۔ وہ مسلم ووٹ کے نام پر اپنا مفاد پورا کرتے ہیں۔ جنھیں ان کے محلے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا راتوں رات مسلمانوں کے لیڈر بن گئے۔ انھوں نے مسلم فوج بنانے کا دعویٰ کیا۔ انھوں نے اجودھیا مارچ کا نعرہ لگایا۔ ان قائدین ملت نے شہیدی دستے بنائے۔ انھوں نے لاکھوں کی تعداد میں حفاظتی دستے اجودھیا بھیجنے کا اعلان کیا۔ آج ہندستان کے مسلمان اگر یہ سوال کر رہے ہیں کہ یہ مسلم فوج، یہ شہیدی دستے اور یہ حفاظتی دستے کہاں ہیں تو کون سا غلط کر رہے ہیں۔ مگر جب پچھلے برس رام مندر کا شلانیاس ہوا تو ان شہیدی دستوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ فیض آباد کی ٹاٹ والی مسجد میں صرف سوا سو ڈیڑھ سو مسلمان جمع تھے۔ اور جب اڈوانی کی رتھ یاترا نکلی تو انھوں نے مسلمانوں پر اپنی بہادری کا سکہ جمانے کے لئے رتھ یاترا روکنے کا اعلان کیا۔ ان کے اس اعلان سے فتح پوری مسجد کے نائب امام کو ترشول تو لگ گیا مگر اس رتھ یاترا کو روکنے کے لئے چڑیا کا بچہ بھی سامنے نہیں آیا۔ انھوں نے حفاظتی دستے کے تحت بابری مسجد کی حفاظت کے لئے پانچ لاکھ مسلمانوں کو اجودھیا بھیجنے کا اعلان کیا مگر پانچ مسلمان لیڈر اجودھیا تو دور کی بات ہے فیض آباد بھی نہیں پہنچے۔

پچھلے گیارہ ماہ میں بی جے پی والے حکومت کے حمایتی ہونے کے باوجود مسلسل منظم طور پر اجودھیا پر دھاوا بولنے اور بابری مسجد میں گھسنے کی تیاری کرتے رہے۔ مگر یہ بابری مسجد کے لیڈر صرف وزیر اعظم وی پی سنگھ سے ملاقاتیں کرکے اور ٹیلیویژن و ریڈیو پر اپنے بیانات جاری کرا کر خوش ہوتے رہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اپنی پوزیشن بنانے کے لئے یہ حفاظتی دستے اور شہیدی دستے بنانے کے لمبے چوڑے بیانات دیتے رہے۔ اپنے ان خالی خولی بیانات سے انھوں نے صرف اور صرف فرقہ پرست ہندو تنظیموں کو تقویت پہنچانے کا کام کیا۔ مسلم فوج کا خوب ڈھول پیٹا گیا۔ مسلم فوج نے بجرنگ

دل، شیوسینا، وشو ہندو پریشد کے وجود کا جواز تو فراہم کیا مگر میرٹھ، بھاگلپور، گونڈا، جے پور، دہلی اور دوسرے درجنوں فسادات میں ایک مسلمان کی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکے۔ ان کا کھیل صرف اتنا رہا کہ وہ ملک کی اہم سیاسی جماعتوں سے یہ تسلیم کرالیں کہ یہ مسلم ووٹوں کے واحد ٹھیکیدار ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی سیاسی جماعت کامیاب نہیں ہوگی۔ انھوں نے نہ تو حکومت سے مسلمانوں کے اقتصادی سماجی و دینی مسائل حل کرنے میں کوئی دل چسپی دکھائی۔ نہ مسلمانوں کو منظم کیا۔ نہ انھیں اعتماد اور حوصلہ دیا۔ نہ ہندو فرقہ پرستوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ٹھوس حکمت عملی بنائی۔ نہ ان کے مفاد میں کوئی دوررس پالیسی مرتب کی۔

جب تک یہ عناصر اقتدار سے دور رہے، جذباتی تقریریں کر کے مسلمانوں کو ٹکراؤ کے راستے پر چلاتے رہے۔ ان کی اسی ٹکراؤ کی پالیسی کا خمیازہ کروروں مسلمانوں کو میرٹھ، ملیانہ، بھاگلپور، بدایوں، نکرانہ، دہلی، بارہ بنکی، الٰہ آباد، حیدرآباد، اندور، جے پور، گونڈا، متھرا، کانپور اور درجنوں فسادات کی شکل میں بھگتنا پڑا۔ آج بھی ملک کے درجنوں شہر میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اور آئندہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ پرانی کہاوت ہے کہ چھیڑو مت اور چھیڑو تو چھوڑو مت۔ لیکن بغیر نتائج کی پروا کئے یہ قائدین وقتی تالیاں بجوانے اور لیڈری چمکانے کے لئے ہندو فرقہ پرستوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ انھیں اپنی مسلم دشمنی کا جواز فراہم کرتے رہے۔ لیکن ٹکراؤ کا اعلان کرنے کے بعد، حالات کو بگاڑنے کے بعد خود ہمیشہ پیچھے ہٹ گئے۔ ان کی اس عاقبت نااندیشانہ پالیسی کا خمیازہ عام مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ آج بھی بھگتنا پڑ رہا ہے اور ابھی برسوں بھگتنا پڑے گا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں مسلمان کبھی اتنا غیر محفوظ نہیں رہا جتنا کہ آج ہے۔ آج مسلمانوں کا جان و مال ہی نہیں ان کی مسجدیں، درگاہیں، قبرستان ان کا دین ایمان سب خطرے میں ہے۔ آج مسلمان بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ آج مسلمان زبردست خوف و ہراس کا شکار ہیں۔ اس کے لئے جہاں ملک کی سیاسی جماعتیں اور ہندو فرقہ پرست تنظیمیں ذمہ دار ہیں وہاں بابری مسجد کے نام پر لیڈری چمکانے والے یہ قائدین ملت بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ آج اگر عام مسلمانوں کا اعتماد ان نام نہاد مسلم لیڈروں پر سے اٹھ گیا ہے تو کیا غلط ہے۔ آج مسلمان مایوسی کے ایسے اندھیرے میں گھر گیا ہے جہاں اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی ہے۔ مگر مسلمان کے لئے مایوسی حرام ہے۔ مسلمان

کو آج اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا ہوگا۔ اپنے نادان دوستوں اور مفاد پرست بہی خواہوں کو پہچاننا ہوگا۔ اور منظم طور پر اپنی حفاظت، اپنی ٹھوس تعمیر، اپنی تعمیر و ترقی کا راستہ متعین کرنا ہوگا۔ اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے کہ جب تعلیم یافتہ، بے لوث اور سمجھدار مسلمان آگے آئیں۔ عام مسلمان لمبے لمبے دعوے کرنے والے لیڈروں کی اصلیت کو پہچانیں اور اپنے درمیان موجود مخلص مگر خاموشی سے کام کرنے والے عناصر کو پہچانیں۔ مسلمانوں کا مستقبل انشاء اللہ آج بھی روشن ہے۔ ہندستان کے کروڑوں مسلمانوں کو دنیا کی کوئی طاقت اپنے جائز حقوق حاصل کرنے اور آگے آنے سے نہیں روک سکتی۔ جس دن مسلمان خوف و دہشت کو تیاگ کر صرف اور صرف اپنے ایمان پر اعتقاد کرتے ہوئے سامنے آئیں گے انھیں زندگی کے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے سے نہیں روکا جاسکے گا (ہفت روزہ نئی دنیا ۹ - ۱۵ نومبر ۱۹۹۰)

اوپر جو "اقتباس" نقل کیا گیا، وہ کوئی منفرد تحریر نہیں۔ آجکل اس قسم کے مضامین کثرت سے اخبارات و رسائل میں شائع ہو رہے ہیں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، مفصل خط مطبوعہ قومی آواز، ۷ نومبر ۱۹۹۰)

مسلمان جو پچھلے برسوں میں نام نہاد لیڈروں کے لفظی بیانات اور جوشیلی تقریروں سے وقتی طور پر انھیں اپنا رہنما سمجھ بیٹھے تھے، وہ اب ان کی نااہلیت کو بخوبی طور پر جان چکے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۰ کے واقعات نے آخری طور پر ان کی حقیقت کھول دی ہے۔ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ مسائل کی نوعیت کو جانتے بھی نہیں، کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ ان میں رہنمائی دیں گے۔ ان نام نہاد لیڈروں نے قرآن کے مطابق، اس کام کا کریڈٹ لینا چاہا تھا جس کو انھوں نے کیا نہیں (آل عمران ۱۸۸) اللہ نے دکھا دیا کہ ایسا کریڈٹ کسی کو اس دنیا میں نہیں ملتا۔

مسلمان اب ان نااہل رہنماؤں کے فریب سے باہر آچکے ہیں، اور خود یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے روشن مستقبل کی یقینی ضمانت ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کے اصل ذمہ دار خود ان کے نام نہاد رہنما ہیں۔ مسلمانوں کا ان رہنماؤں کی حقیقت کو جان لینا ان کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ مسلمانوں کی اس دریافت کے بعد اب کی تعمیر نو کا سفر شروع ہو چکا ہے، اور جو سفر صحیح سمت میں شروع ہو، وہ آخر کار اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

ایک مثال

ایک خبر پڑھیے : برطانیہ کے شہر لیسسٹر میں پچھلے کچھ عرصہ سے مسلمانوں اور مقامی آبادی کے درمیان مساجد میں لاوڈ اسپیکر پر اذان کے سوال پر کچھ ناخوش گواری چلی آرہی تھی۔ مقامی عیسائی آبادی اور محکمہ حفظان صحت کا کہنا ہے کہ لاوڈ اسپیکروں اور ایمپلی فائروں کی آواز ایک خاص حد میں رہنی چاہیے۔ جیسا کہ چرچوں کی گھنٹیوں کی آواز رہتی ہے۔ اور یہ کہ کم سے کم فجر کی اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ اب لندن کے اخبار ٹائمز کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھ گیا ہے۔ مسلم رہنماؤں اور مقامی حکام نے مل بیٹھ کر طے کر لیا کہ اذان لاوڈ اسپیکر پر بدستور ہوتی رہے گی لیکن محدود آواز میں۔ مسلمان فجر کی اذان میں یہ آلہ استعمال نہیں کریں گے۔ اب صرف عشار کی اذان کے وقت کا معاملہ ہے۔ حکام کہتے ہیں کہ یہ اذان زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے دے دی جائے۔ جبکہ ائمہ کا اصرار ہے کہ اس کا وقت نو سے ساڑھے نو بجے تک ہونا چاہیے۔ اخبار کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ بھی سلجھ جائے گا (سہ روزہ دعوت ۲۵ جولائی ۱۹۹۰)

مذکورہ واقعہ میں برطانیہ کے مسلمانوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ الرسالہ اسی ایڈجسٹمنٹ کی دعوت دیتا ہے، مگر وہی مسلمان جو برطانیہ میں ایڈجسٹمنٹ پر راضی ہو جاتے ہیں، انھیں سے جب ہندستان میں ایڈجسٹمنٹ کی بات کہی جائے تو وہ اس کو "بزدلی" کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہی ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ یہ مسلمان باہر کے ملکوں میں جا کر جس طرح رہتے ہیں، اگر اسی طرح وہ ہندستان میں بھی رہنے لگیں تو یہاں کے فرقہ وارانہ مسائل اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ وہ تھے ہی نہیں۔

ایڈجسٹمنٹ بزدلی نہیں، ایڈجسٹمنٹ زندگی کا اصول ہے۔ اس کی ضرورت ہر جگہ اور ہر ملک کے لیے ہے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ اس کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر اس کی ضرورت اور اہمیت ہر جگہ یکساں طور پر باقی رہتی ہے۔ ایڈجسٹمنٹ کے بغیر اس دنیا میں زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

مزید یہ کہ یہ انداز مدعو کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دعوت کے بارہ میں ہمدردانہ غور کر سکے۔ اس اعتبار سے یہ طریقہ سراسر حکمت ہے نہ کہ عام معنوں میں صرف ایک مصلحت۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۔ ۶۸

۱. جناب احمد بختیار الدین صاحب ایم ایس سی سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ انھوں نے مطلع کیا ہے کہ ان کے پاس الرسالہ (اردو، انگریزی) اور اسلامی مرکز کی کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ سعودی عرب میں جو حضرات ان سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں وہ ان سے ان رسالوں اور کتابوں کو برائے مطالعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ موصوف کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر یہ ہے:

احمد بختیار الدین ، ادارۃ الاحصاء ، وزارۃ الصحۃ ، الریاض (Tel. 4012220, Ex. 1461)

۲ صدر اسلامی مرکز نے اکتوبر ۱۹۹۰ میں رام پور کا سفر کیا۔ وہاں خطاب اور ملاقاتوں کے پروگرام ہوئے۔ اس سفر کی تفصیل انشاء اللہ سفرنامے میں شائع کر دی جائے گی۔

۳ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی سے ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کو نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: مذہب کے نام پر۔ یہ تقریر انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴ جناب عبد الصمد شیخ پونہ سے لکھتے ہیں کہ پونہ میں ۲۸ ستمبر سے ۸ اکتوبر ۱۹۹۰ تک نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے کتابوں کی نمائش تھی۔ اس موقع پر پونہ کے حلقہ الرسالہ کی طرف سے الرسالہ اور کتابوں کا اسٹال لگایا گیا۔ کافی لوگوں نے دیکھا اور معلومات حاصل کیں۔ انگریزی کتابوں کا جو ذخیرہ اسٹال پر رکھا گیا تھا، وہ سب کا سب ختم ہو گیا۔ ۸۳ آدمیوں نے رجسٹر پر اپنے خیالات قلم بند کئے۔ زیادہ تر غیر مسلم صاحبان آئے۔ ان میں الرسالہ انگریزی اور منزل کی طرف (مراٹھی) پانچ سو کی تعداد میں لوگوں کے درمیان تقسیم کئے گئے۔

۵ نواب خاں صاحب (جنتا شپنگ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ) ۱۸ ستمبر ۱۹۹۰ کو دہلی آئے۔ وہ یہاں جنتا دل کے دفتر میں گئے۔ ان کے ہاتھ میں "رازحیات" تھی۔ مسٹر ہری موہن دھون (سکریٹری جنتا دل) نے اس کتاب کو دیکھا اور اس کا ایک صفحہ پڑھا۔ ان کو کتاب بہت پسند آگئی۔ نواب خاں صاحب نے وہ کتاب ان کو ہدیۃً دے دی۔ اس طرح کی کثیر مثالیں ہیں جب کہ صرف ایک دو صفحہ دیکھ کر آدمی مرکز کی مطبوعات کا گرویدہ ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔

۶ اللہ کے فضل سے الرسالہ اس وقت سب سے زیادہ پڑھا جانے والا پرچہ بن چکا ہے۔ اس کا ایک اندازہ مرکز جماعت اسلامی ہند (دہلی) کے خط مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰ سے ہوتا ہے۔

خط کا مضمون یہ ہے : مولانا ابو اللیث صاحب ، سابق امیر جماعت اسلامی ، جولائی ۱۹۹۰ میں اپنے وطن اعظم گڈھ تشریف لے جا چکے ہیں ۔ موصوف کی خواہش ہے کہ الرسالہ ان کے گھر کے پتہ پر بھیجا جایا کرے ۔ براہ کرم ان کا پتہ نوٹ فرمالیں اور آئندہ ان کے گھر کے پتہ پر الرسالہ بھیجیں ۔ تعاون کے لیے شکریہ ۔ (افسوس کہ دسمبر ۱۹۹۰ میں مولانا کا انتقال ہو گیا اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے ۔ آمین)۔

۷ وقار عالم صاحب دہلی کی ایک مسجد (پھاٹک حبش خاں) میں امام ہیں ۔ انھوں نے بتایا کہ ہر جمعہ کو خطبہ سے پہلے انھیں ۲۰ منٹ تک تقریر کرنا ہوتا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ الرسالہ کی باتوں کو لے کر تقریر کرتے ہیں ۔ اس طرح کے اور بہت سے امام ہیں جو اسی طرح مسجد کی تقریروں میں الرسالہ کی باتیں بیان کرتے ہیں ۔

۸ وجیہہ الدین صاحب انجینئر حیدر آباد سے پر انڈا (ضلع عثمان آباد) گئے ۔ وہاں اصغر حسینی صاحب (ریٹائرڈ سب رجسٹرار) کے گھر پر انھوں نے الرسالہ دیکھا ، انھوں نے اصغر حسینی صاحب سے پوچھا کہ آپ الرسالہ پڑھتے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ میں تو برسوں سے اس کو پڑھ رہا ہوں اور اس کی ۲۰ کاپی منگا کر اپنے حلقہ میں لوگوں کو دیتا ہوں ۔ میرا کہنا ہے کہ " اگر کسی شخص کے مطالعہ میں الرسالہ نہیں ہے تو اس کا مطالعہ ناقص ہے "

۹ میں تقریباً ساڑھے تین سال سے الرسالہ کا مطالعہ کرتا ہوں ، دیگر پرچوں کو پڑھتا ہوں ، اور اس پرچے کا مطالعہ کرتا ہوں ، پھر دونوں کے مضامین سے نتیجہ اخذ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ دیگر پرچہ کے مضامین انسانیت سازی کی جگہ انسانیت سوزی کرتے ہیں ، اور اس جریدہ کے مضامین انسانیت سازی کرتے ہیں (عزیز الحق ، مدھوبنی)

۱۰ مالیگاؤں کے ایک صاحب برٹرینڈ رسل کے اسلوب تحریر سے حد درجہ متاثر تھے ۔ ان کے بقول کسی مصنف کی تحریر میں ان کے لئے کوئی کشش اور دل چسپی کا سامان باقی نہیں رہا تھا ۔ اس کے بعد ان کو مرکز کی مطبوعات برائے مطالعہ دی گئیں ۔ ان کو پڑھ کر انھوں نے برجستہ طور پر اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہا کہ برٹرینڈ رسل کی تحریروں میں مجھے جو ادبی ٹیسٹ ملا تھا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اردو میں بھی وہ ادبی ٹیسٹ موجود ہوگا ۔

۱۱ سہارن پور سے ایک ہندی ہفت روزہ جاری ہوا ہے ۔ اس کا نام " سماج گورو ٹائمس " ہے ۔

اس میں الرسالہ کے تعمیری مضامین شائع کئے جارہے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے انشاءاللہ ایک نئے حلقہ میں الرسالہ کی آواز پہنچ سکے گی۔

۱۲ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایجوکیشنل پلاننگ کے تحت ایک کمیٹی تعلیم اقدار اور تعمیر اخلاق (Value education & character building) کے مقصد کے لئے غور اور تجویز کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کے کنوینر مسٹر کے سچدانند مورتی ہیں۔ اس کمیٹی میں "کو آپٹڈ ممبر" کی حیثیت سے صدر اسلامی مرکز کا انتخاب کیا گیا۔ انھیں دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس کے اجلاس منعقدہ ۶ اگست ۱۹۹۰ میں شرکت کرکے متعلقہ موضوع پر اپنی رائے دیں۔ مگر ایک بیرونی سفر میں ہونے کی وجہ سے صدر اسلامی مرکز اس اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ کچھ متعلقہ انگریزی لٹریچر انھیں روانہ کر دیا گیا۔

۱۳ تبلیغی جماعت کے ایک صاحب لکھتے ہیں: میں ۱۹۸۰ سے الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ اور آپ کے مضامین کا شیدائی ہوں اور کالج کے لوگوں کو بھی دیتا رہتا ہوں۔ نومبر ۱۹۹۰ میں مہاراشٹر کا اجتماع ہوا۔ وہاں حضرت والا کی کتابیں ایک ایک اسٹال پر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہاں سے کتابیں حاصل کرکے گھر لایا۔ الحمدللہ حضرت کی تحریروں کو پڑھ کر لوگوں کے اندر جماعتوں میں نکلنے کی توفیق ہو رہی ہے۔ اور لوگوں کے اندر ایک قسم کا ذہنی انقلاب آرہا ہے (محمد رمضان دھولی ۴۲۴۰۰۱)

۱۴ لاہور سے اکتوبر ۱۹۸۹ سے ایک نیا ماہنامہ جاری ہوا ہے۔ اس کا نام تذکیر ہے۔ اس کے صفحہ اول پر الرسالہ کی کوئی مختصر عبارت نقل کی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اندر کے صفحات میں ہر ماہ الرسالہ کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ یہ گویا الرسالہ کے مشن کے نئے مرحلہ میں داخل ہونے کی ایک علامت ہے۔

۱۵ قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لحاظ سے ضرورت پیش آگئی ہے کہ الرسالہ کی قیمت میں بھی اضافہ ہو۔ مگر افادیت کے پہلو سے بہتر یہی ہے کہ اضافہ نہ کیا جائے۔ ہم اپنے ہمدردوں اور دینی جذبہ رکھنے والوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ "سبسڈی" کا انتظام فرمائیں۔ یعنی اپنی طرف سے مالی تعاون دیں تاکہ اس کے خسارہ کی تلافی ہو۔ ہم کو امید ہے کہ لوگوں کی طرف سے ہم کو اتنا تعاون ملے گا کہ قیمت میں اضافہ کیے بغیر الرسالہ کو جاری رکھا جاسکے۔

RNI 28822/76 □ March 1991 No. 172 □ **Rs. 5**

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلّد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	25/-
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	15/-
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	30/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیات طیبہ	5/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر۱ ایمان	25/-
نمبر۲ جدید امکانات	25/-
نمبر۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر۴ اتحاد	25/-
نمبر۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر۶ سنت رسولؐ	25/-
نمبر۷ میدان عمل	25/-
نمبر۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-
इन्सान! अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-
पैग़म्बरे-इस्लाम	3/

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳